مولانا داؤد اکبر اصلاحی

نوائے کارگر: احسان دانش کی اس معرکۃ الآرا کتاب میں اُن کی وہ شاعری ہے جس کی آج ملک و قوم کو ضرورت ہے۔ اس کی بیشتر درد انگیز نظموں میں انسانی معاشرے کے بیمار پہلوؤں کی عکاسی میں شاعر اُس مقام پر نظر آتا ہے جہاں شعر کا ہر لفظ اس کا شاہکار ہوتا ہے۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے

چراغاں: یہ کتاب بھی احسان دانش کی انہیں نظموں کا باقی سلسلہ ہے جو نوائے کارگر میں آئی ہیں کیونکہ اس میں بھی ورق ورق پر وہی حقیقی نقاشی وہی اخلاقی دیانت وہی جذبات نگاری بول رہی ہے۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

آتشِ خاموش: اس کتاب میں نوائے کارگر اور چراغاں کی طرح آنسوؤں کا زیادہ حصہ نہیں بلکہ نظمیں میں جو قوتوں اور رنگینیوں کا نتیجہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ اس کی ہر نظم میں شاعر ڈبڈبائی آنکھوں سے سماج پر برستا ہے اور پڑھنے والے کا خون جوش کھانے لگتا ہے۔

قیمت دو روپے

جادۂ نو: یہ کتاب ان جدید طرز کے قطعات کا مجموعہ ہے جس میں اس حساس شاعر نے سیکڑوں مناظر اور معاشرت کے خستہ پہلوؤں کو تشبیہی عمل سے چولی دامن کیا ہے۔ اس میں کیا شک کہ احسان کو قدرت نے نقاشِ فطرت پیدا کیا ہے مگر یہ کتاب بھی اس کا ایسا شاہکار ہے کہ اسے تاریخ کے صفحات میں محترم رکھے گا۔

قیمت سوا روپیہ

زخم و مرہم: یہ کتاب بھی قطعات کا مجموعہ ہے جس میں عموماً دیہاتی زندگی کے بیشمار مرقعے سے ملیں گے جو صحیح معنی میں جدید ادب کہلانے کے مستحق ہیں اور جن میں شوخی بھی، معصومیت بھی، سادگی بھی اور پُرکاری بھی۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ دانش مزنگ لاہور

مشکلات القرآن

مولانا داؤد اکبر اصلاحی

شرگاہ پنجاب مزنگ لاہور

دو روپے

فہرست مضامین

ذبح بقرہ اور قتل نفس
کے
واقعہ کی تحقیق

سورۂ بقرہ میں ذبح بقرہ اور قتل نفس کے واقعات یکے بعد دیگرے مذکور ہیں۔ ذبح بقرہ پہلے اور قتل نفس اس کے بعد۔ عام خیال یہ ہے کہ قتل نفس کا واقعہ اصل ہے اور ذبح بقرہ کا ذکر ضمنی طور پر قاتل کے ذریعہ تحقیق ہونے کی حیثیت سے آیا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کے ہاتھ مارا گیا اور اس کے قاتل کا سراغ نہ لگتا تھا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "اللہ کا حکم یہ ہے کہ ایک گائے ذبح کرکے اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم پر مارو تو وہ جی اٹھے گا اور آپ اپنے قاتل کو بتا دے گا! انھوں نے ایسا کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس طرح اس مردے کو جلا دیا اور اس نے قاتل کو بتا دیا کہ فلاں شخص نے مجھے قتل کیا ہے۔"

اوپر کے شان نزول کی صحت و عدم صحت کے قطع نظر اب بات یہاں قرآن مجید کے ہر طالب علم کو کھٹکے گی کہ ذبح بقرہ اور قتل نفس کا ذکر اگر دو مستقل واقعہ کی حیثیت سے نہیں کرنا ہے تو پھر ہر ایک کا آغاز اِذْ سے کیوں کیا گیا جب کہ قرآن پاک اور کلام

عرب میں اِذْ مستقل واقعہ کی تعبیر کے لئے آتا ہے اور اس سورہ میں تو بڑی کثرت سے اِذْ اس حیثیت سے آیا ہے اور ہر جگہ کسی نہ کسی مستقل واقعہ کی تذکیر کے لئے آیا ہے خود ذبح بقرہ اور قتل نفس کے ذکر سے پہلے اور بعد میں بہت سے وقائع اِذْ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔ اطمینان کے لئے اس کے آگے پیچھے کی آیات ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔

آیات	ترجمہ
وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ	اور یاد کرو جب آل فرعون کے پنجے سے ہم نے تمہیں
سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ	رہائی بخشی حالانکہ وہ تمہیں سخت عذاب
يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ	میں مبتلا کرتے تھے تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے
بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ وَاِذْ فَرَقْنَا	تھے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور
بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ	اس صورتِ حال میں تمہارے پروردگار کی جانب
فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ	سے زبردست آزمائش تھی اور یاد کرو جب ہم نے
وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً	تمہارے سبب دریا پھاڑ دیا پس تمہیں خلاصی
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ	بخشی اور آل فرعون کو تمہارے دیکھتے دیکھتے غرق
وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ	کر دیا اور یاد کرو جب موسٰے سے چالیس رات
مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	کا وعدہ کیا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود
وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ	بنایا اور ایسا کر کے تم نے اپنے اوپر ظلم کیا پھر اس کے
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى	بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو

لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ
فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ وَاِذْ قُلْتُمْ
يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ
جَهْرَةً

جب ہم نے موسے کو کتاب اور فرقان دیا تاکہ
تم راہ یاب ہو اور یاد کرو جب موسے نے اپنی قوم
سے کہا اے لوگو تم نے بچھڑا بنا کر اپنے اوپر ظلم
کیا پس اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اپنے آپ کو
(یعنی انہیں جنہوں نے بچھڑا بنا لیا ہے اور اس کی
پرستش کی ہے) قتل کرو یہ تمہارے لئے تمہارے
پروردگار کے نزدیک بہتر ہے پس خدا تم پر اپنی رحمت
کے ساتھ لوٹ آیا بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا
مہربان ہے اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا ہم
تمہاری اس وقت تک تصدیق کرنے والے نہیں جبتک
خدا کو کھلے طور پر دیکھ نہ لیں۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا
وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ....
وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا
اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ....
وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ

اور یاد کرو جب ہم نے کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ
پس اس سے جہاں چاہو فراغت کے ساتھ کھاؤ اور
دروازہ (عبادتگاہ کے دروازہ) میں جھک کر داخل ہو
اور یاد کرو جب موسے نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا
تو ہم نے کہا اپنے عصا سے پتھر پر مارو.....
اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسے ایک قسم کے کھانے پر
ہمیں قرار نہیں رہ سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۖ قَالُوْا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ۔۔

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا خدا تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے انہوں نے کہا کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے موسیٰ نے کہا اللہ کی پناہ۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا۔۔۔

اور یاد کرو جب تم نے ایک جان مار ڈالی پس تم اس کے بارے میں جھگڑے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپاتے تھے پس ہم نے کہا اسے (مقتول کی نعش (وہ شخص جس کے مجرم ہونے کے قرائن ہوں) سے مس کرو)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ کہ خدا ہی کی عبادت کیجو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کیجیو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ الآية

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ اپنے بھائیوں کا خون نہ کیجیو اور نہ انہیں اپنی بستیوں سے نکالیو پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس پر گواہ ہوئے پھر بھی تم اپنے بھائیوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔

(۶۷ - ۸۵ بقرہ)

دیکھیے مندرجہ بالا آیات میں تیرہ جگہ اِذْ آیا ہے اور ہر جگہ کسی نہ کسی مستقل واقعہ
کی تعبیر کے لئے لایا گیا ہے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ بیچ کے دو اِذْ یعنی وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی
لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً اور وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا
سے دو الگ الگ مستقل واقعات نہ مانے جائیں طوالت سے بچنے کے لئے آیات
کے نقل کرنے میں ہم نے ضروری ٹکڑوں ہی پر کفایت کی ہے بقیہ حصوں کو حذف کر دیا ہے۔

عام خیال قبول کرنے میں اِذْ کی مذکورہ بالا زحمت کے ساتھ ایک دوسری زحمت
ترتیب واقعہ کی ہے بالفاظ دیگر عام خیال کی رو سے ترتیب واقعہ وہ نہ ہونی چاہیے
جو پائی جا رہی ہے بلکہ پہلے قتل نفس اور پھر ذبح بقرہ کا ذکر ہونا چاہیے کیونکہ پہلے کوئی
واقعہ ہو لیتا ہے تب تحقیقات ہوتی ہے اور یہاں معاملہ الٹا نظر آتا ہے نفس واقعہ کے
ذکر سے پہلے ذریعہ تحقیق کا ذکر ملتا ہے اور پھر واقعہ لایا جاتا ہے حالانکہ ذبح بقرہ کا حکم
اگر ذریعہ تحقیق کے طور پر ہے تو اسے بعد میں ہونا چاہیے اور پہلے نفس واقعہ ذکر میں آنا
چاہیے تھا اور ترتیب یوں ہونی چاہیے تھی۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ فَقُلْنَا لِمُوْسٰی
اَنْ یَّقُوْلَ لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً فَاضْرِبُوْہُ بِبَعْضِھَا قَالُوْٓا
اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ
یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ عَوَانٌۢ بَیْنَ
ذٰلِکَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا قَالَ اِنَّہٗ

يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ فَضُرِبَ بِبَعْضِهَا فَحَيِيَ الَّذِي قُتِلَ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ"

حاصل کلام یہ کہ اِذ کا عام استعمال اور بیان واقعہ کی ترتیب کا اقتضاء ہے۔ کہ ذبح بقرہ اور قتل نفس کو الگ الگ دو مستقل واقعہ قرار دیا جائے اور دونوں کے ذکر کی مصلحت جدا جدا ٹھہرائی جائے، سوال ہو سکتا ہے کہ ذبح بقرہ کے حکم کی اگر وہ مصلحت نہیں ہے جو عام طور سے بیان کی جاتی ہے تو پھر اس کے علاوہ اس کے ذکر کا یہاں کیا موقع ہے، ذیل میں ہم اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ذبح بقرہ کے ذکر کا جس موقع پر ذبح بقرہ کا حکم مذکور ہے اس سے پہلے اور بعد میں بنی اسرائیل
موقع اور اس کی غایت کے نقض میثاق کی بہت سی مثالیں ذکر کی گئی ہیں اور ان میں ان کا سب سے بڑا نقض میثاق گوسالہ پرستی میں مبتلا ہونا تھا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم انہیں بطور کفارہ جرم کے دیا گیا ہو اور اس پر انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا ہو کہ آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں کیا؟ کہ اس جرم پر گائے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں اس سے حاصل کیا؟ اور اس حکم کی تعمیل سے بچنے کے لئے طرح طرح کے

جیسے ڈھونڈے ہوں ایسا ہونا بعید نہیں ہے کیونکہ توراۃ میں گناہ ہو جانے پر کثرت سے ذبح بقرہ کا حکم ملتا ہے۔ اطمینان کے لئے دو ایک مثالیں ذیل میں ہم نقل کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

"پھر تو اس بیل (بقر) کو جماعت کے خیمے کے آگے لا اور ہارون اور اس کے بیٹے اپنے ہاتھ اس بیل کے سر پر رکھیں اور اس کو خداوند کے رو برو جماعت کے خیمے کے دروازے پر ذبح کر اور اس بیل کے خون میں سے کچھ لے اور اپنی انگلی سے قربان گاہ کے سینگوں پر لگا اور باقی خون قربان گاہ کے نیچے ڈھال دے اور تو اس کی وہ سب چربی جو اس کے پیٹ کو چھپانے والی ہے اور جربی کی جھلی کو جو کلیجے کے اوپر ہے اور دونوں گردوں کو اور وہ چربی جو ان دونوں پر ہے لے اور قربان گاہ پر جلا اور بیل کا گوشت اور اس کی کھال اور اس کا گوبر باہر خیمہ کے آگ سے جلا اس لئے کہ یہ خطا کی قربانی ہے[1]"

اسی باب میں آگے چل کر یوں ارشاد ہے۔

"اور تو ہر روز ایک بیل کو گناہ کی قربانی کے لئے کفارے کے واسطے ذبح کر[2]"

توراۃ کے مذکورہ بالا حوالوں سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے یہاں گناہ کے کفارے میں بیل (بقر) ذبح کرنے کا دستور تھا اور غالباً اس کی ابتدا گوسالہ پرستی کے واقعے سے ہوئی اور گائے ذبح کرنے کا اس لئے حکم دیا گیا کہ گائے کی وہ محبت و عظمت

---

[1] آیات (۱۱-۱۵) باب ۲۹ خروج [2] آیت ۴۰ باب ۲۹ خروج

جو مصری زندگی میں ان کے اندر جاگزیں ہوگئی تھی نکل جائے۔ نیز اس لئے یہ حکم دیا گیا۔
کہ پوری قوم کی جانب سے گوسالہ پرستی کے گناہ کا کفارہ ہو جائے اور منزید اس پر
تورات کے مذکورہ بالا حوالجات ہیں اور خود سورہ بقرہ میں جہاں اس کا ذکر ہے اس
سے اوپر بنی اسرائیل کے جرائم کی جو فہرست درج ہے اس میں گوسالہ پرستی ام الجرائم کی
حیثیت میں ہے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ذبح بقرہ کا حکم بنی اسرائیل کے لئے بطور کفارہ
جرم (گوسالہ پرستی) کے نہ مانا جائے جبکہ قرائن سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔

اب ہم قتل نفس کے واقعہ کی تحقیق کریں گے نیز اس کے ذکر کی مصلحت بتائیں گے۔

قتل نفس کے ذکر کا موقع اور اس کی غایت } قتل نفس کے ذکر کا موقع اور اس کی غایت وقائع کے ذکر میں قتل نفس کا ذکر ذبح بقرہ کے بعد ہوا ہے۔ اور اس کا منشا عہد نزول قرآن کے یہود پر یہ الزام قائم کرنا ہے کہ تم ان کے خلف ہو جن کے سلف اپنے بھائیوں کا خون کرنے میں بیباک تھے اور جو خون ہو جانے پر قاتل کی سراغ رسانی میں بے اعتنائی ہی نہیں برتتے تھے۔ بلکہ کتمان خون کے مرتکب (وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ) تھے، چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔ کہ ایک اسرائیلی کا خون ہو گیا اس پر سب نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی تو وقت کے پیغمبر (اگر حضرت موسیٰؑ کے عہد کا واقعہ ہے تو خود انہیں نے ورنہ انبیائے بنی اسرائیل میں سے کسی اور نے) تفتیش پر ابھارا اور تحقیقات شروع ہوئی اور قاتل کا سراغ لگ گیا اور اس پر تورات کا قانون جاری ہوا، ایسا ہوتا تھا کہ از سر نو سارے بنی اسرائیل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور سب کے سب خطرہ سے مصئون و مامون ہو گئے، سوال ہو سکتا ہے کہ اگر

یہ بات ہے کہ پھر اَضْرِبُوْہُ بِبَعْضِہَا اور کَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کا کیا مفہوم ہوگا بظاہر تو ان ٹکڑوں سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ گائے کے گوشت کے ٹکڑے سے حسب حکم مقتول پر ضرب لگائی گئی اور وہ زندہ ہوگیا لیکن بات یوں نہیں ہے بلکہ اَضْرِبُوْہُ بِبَعْضِہَا میں ہٗ کا مرجع بتاویل مذکر مقتول ہے اور ھا کا مرجع نفس غیر مقتول ہے یعنی جس کسی پر شبہ ہو اور قومی قرائن سے اس کے قاتل ہونے کی تائید ہو رہی ہو اس سے مقتول پر ضرب لگاؤ یعنی اس پر جسپاں کرو۔ چنانچہ تفتیش شروع ہوئی اور قاتل کا سراغ لگ گیا، ایسا ہوتا تھا کہ یکایک پوری جماعت بنی اسرائیل جو بمنزلہ موتی (مردہ) ہو رہی تھی اسے زندگی نصیب ہوگئی۔ اسی پرامن حالت کے قائم ہونے کو زندگی سے تعبیر کیا ہے اور قانون قصاص کے نفاذ میں لوگوں کی زندگی کا ہونا اور اس کے اٹھ جانے کو موت سے تعبیر کرنا کوئی نئی اور غریب تعبیر نہیں ہے اور جگہ بھی اس طرح کی تعبیرات قرآن پاک میں موجود ہیں، خود اسی سورہ میں ایک جگہ ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹ بقرہ)	اور قانون قصاص میں زندگی ہے اے اہل دانش تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔

ایک دوسری جگہ یوں ارشاد ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا	اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل پر ضروری قرار دیا تھا کہ جس کسی نے کسی کو ناحق قتل کر دیا یعنی نہ اس مقتول نے

بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا الآیہ (۳۲ مائدہ)	کسی کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا تھا اور نہ زمین میں کسی طرح کا فساد مچایا تھا) تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے کسی مقتول کو زندہ (یعنی اس کا قصاص لے لیا) کر دیا تو گویا اس نے سب کو زندہ کر دیا۔

دیکھیے اوپر کی ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں قانونِ قصاص کو زندگی قرار دیا ہے یعنی قاتل سے قصاص لے لینے میں زندگی ہے۔ حالانکہ بظاہر زندگی نہیں بلکہ ایک شخص کی موت ہوتی ہے اور دوسری آیت میں نہایت وضاحت سے ایک شخص کے ناحق قتل ہو جانے اور اس پر قصاص نہ لینے کو پوری جماعت کی موت کے مرادف ٹھہرایا ہے اور اس کا قصاص لے لینے کو سب کی زندگی قرار دیا ہے، اس کا راز یہ ہے کہ امن کا قیام قانون کے نفاذ پر مبنی ہے اور جب قانون عمل نہ کرے تو پھر زندگی زندگی نہیں بلکہ موت ہے اور جماعت زندہ نہیں بلکہ مردہ بشکل زندہ ہے۔ اِنْ اَصَبْتَ فَمِنَ اللّٰہِ وَاِنْ اَخْطَاْتَ فَمِنْ نَفْسِیْ

سورہ اعراف کی ایک آیت

اور

اس کی تاویل

سورۂ اعراف کی آیت "فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا" الآیہ (۱۶۵) کے تحت ملک کے موقر رسالہ ترجمان القرآن میں ایک نیا خیال پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں سلف کا جو خیال اس باب میں رہا ہے وہی جواب ہے قبل اس کے کہ سلف کے خیال کی ترجمانی کی خدمت ہم انجام دیں مناسب ہوگا کہ ترجمان القرآن میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اسے اجمال کے ساتھ سامنے لادیں تاکہ اصل حقیقت تک پہنچنے میں سہولت ہو۔ جن صاحب کو تفصیل مطلوب ہو وہ رسالہ مذکور کے جولائی تا اکتوبر ۱۹۴۷ء کے مجموعہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔

اس آیت سے متعلق رسالہ مذکور کے صفحہ ۴۲ کا تشریحی نوٹ ملاحظہ ہو: "اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک وہ جو دھڑلے سے

احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کر رہے تھے۔ مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کمبختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے، تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں اور اگر وہ راہ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی براءت کا ثبوت پیش کر دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اللہ کا عذاب اس بستی پر آیا تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس عذاب سے بچایا گیا کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے"۔ اس کے بعد سلف کے اس خیال کی صحت سے انکار کیا گیا ہے کہ نجات پانے والے دو گروہ ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نجات پانے والا ایک ہی گروہ تھا۔ سورہ انفال کی آیت "وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً" الآیہ اور ایک حدیث سے بھی اس خیال کو مشتبہ کیا گیا ہے۔

سلف میں سے بعض مفسرین کا بھی خیال تھا کہ "لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ

مُہلِکُھُم الایہ" کہنے والے گروہ کا شمار ظالموں میں تھا اور اس کا بھی وہی حال ہوا
جو ظالمین کا ہوا لیکن بعد میں انہوں نے اس خیال سے رجوع فرما لیا تھا اور جمہور
مفسرین کی اس رائے سے اتفاق کر لیا تھا کہ اس کا شمار ظالموں میں نہیں بلکہ انجینا
الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْءِ میں وہ بھی داخل ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر وہ کیا
وجوہ ہیں جن کی بنا پر تم جمہور کی رائے صحیح سمجھتے ہو کیا جمہور پرست تو نہیں ہو؟ ایسا
نہیں ہے کیونکہ ہم تو اور معتی کر کے بدنام ہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ اس باب میں حق و
صواب انہیں کے ساتھ ہے اس لئے ان کی رائے کی تائید کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے
محترم صاحب ترجمان القرآن کی رائے کی تائید اگر آیت کے سیاق و سباق سے
ہوتی تو ہم ضرور تسلیم کر لیتے لیکن اس جہت سے جب آیت مذکورہ کا جائزہ لیتے ہیں
تو بجز " اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْءِ " کے ٹکڑے کے اور کوئی لفظ ایسا نہیں
ملتا جس سے اس شبہ کی گنجائش بھی نکل سکے کہ " لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاِ اللّٰہُ مُہْلِکُھُمْ
اَوْ مُعَذِّبُھُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا " کہنے والا کا شمار ظالموں میں ہوا اور اس کا انجام
معتدین فی السبت کا ہوا برعکس اس کے بہت سے ایسے قرائن ہیں جن سے
اس امر کی طرف رہبری ہوتی ہے کہ جس طرح یہ گروہ دوسری قسط کے عذاب سے محفوظ
رہا (بقول صاحب ترجمان القرآن) اسی طرح پہلی قسط کے عذاب سے بھی محفوظ رہا
کیونکہ " اَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ " کے
ٹکڑے میں ظَلَمُوْا اور یَفْسُقُوْنَ سے ان لوگوں کے جرائم پر نشان دہی کی گئی

ہے جو بڑے دھڑلے سے سبت کے احکام کی بے حرمتی کر رہے تھے اور کوئی قرینہ ایسا نہیں جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ان جرائم میں "لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰہُ مُھْلِکُھُمْ" کہنے والے گروہ کی بھی شرکت ہے اور اگر یہ بھی اس میں شامل ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کا ظلم اور فسق کیا ہے اور اگر خاموشی کی بنا پر (اقتباس صاحب ترجمان القرآن) ان کا شمار ظالموں میں ہوا تو کوئی وجہ نہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں تو وہ شامل مانے جائیں اور دوسری قسم کے عذاب سے انہیں بری قرار دیا جائے، اگر ظالم کے درجہ میں فرض کر کے پہلی قسط کے عذاب کا انہیں مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ تو پھر دوسری قسط کے عذاب کا مورد ٹھہرانے میں کیا مانع ہے۔ اس تقسیم یعنی پہلی قسط کے عذاب کی زد میں تو وہ آئے اور دوسری قسم کے عذاب سے محفوظ رہے اس پر کوئی قرینہ نہیں ہے، سیدھی سی بات تو یہ ہے اگر وہ ظالم ہیں تو ظالمین کا جو مآل ہوا وہی ان کا بھی ہونا چاہئے، دونوں قسطوں میں ظالموں پر (قرآن کے الفاظ سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے) اگر عذاب آیا ہے تو پھر اس کی زد میں انہیں بھی آنا چاہئے کیونکہ یہ ظالم ہیں، ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ آیت کے اس ٹکڑے "اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ" کے ظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نجات صرف انہیں لوگوں کو ہوئی جنہوں نے احکام سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کو اس سے روکنے میں جد و جہد کی اور بقیہ لوگ عذاب کی زد میں آئے۔ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور غلط فہمی

وسائل اسی نکتے سے ہوئی ہے حالانکہ "اَلَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ" میں وہ بھی داخل ہیں جو ان کی اصلاح میں جد و جہد کر کے تھک گئے تھے اور اب مزید ان کے افہام و تفہیم میں کوشش تضییع اوقات تصور کرتے تھے اور جب کوئی ان کی اصلاح کے لئے قدم اٹھاتا تو علی تجربۃً کہتے کہ دیوار کو سنانے سے کیا حاصل یا بقول صاحب ترجمان القرآن "ان کمبختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل" اور یہ واقعہ ہے کہ جب کوئی داعی حق کسی جماعت کی اصلاح پذیری سے مایوس ہو جاتے اور اسے تجربے سے یقین ہو جائے کہ اس جماعت کو سمجھانا لاحاصل ہے تو اس کے لئے مناسب ہے کہ ایسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت میں کام کرے مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کیونکہ ایسا عمل کرنے سے کیا فائدہ جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو۔ پیغمبروں کو بھی اس طریقہ دعوت کی تلقین کی گئی ہے یہ امر بات ہے کہ انبیاء کرام نے ایسوں کو راہ راست پر لانے کی انتہائی کوشش کی ہے جن سے کوئی توقع نہ تھی لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایسوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے۔ اور پیغمبر عالم کو تو بے شمار مقامات پر ایسے لوگوں کے پیچھے وقت صرف کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نیز بعد کے حالات نے اس کی تصدیق بھی کر دی کہ احکام سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کے بارے میں جو رائے انہوں نے قائم کی تھی۔ وہی ٹھیک نکلی یعنی جو لوگ ان کی افہام و تفہیم میں لگے ہوئے تھے ان کی ایک نہ سنی گئی انہوں نے کہا تھا انہیں سمجھانے سے کوئی حاصل نہیں ان پر تو عذاب الٰہی بھڑکنے

کو ہے چنانچہ ویسا ہی ہوا، ان کی دعوت وتذکیر بالکل بے اثر رہی اور عذاب الٰہی کی زد میں آ گئے ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے ان کے عذاب سے محفوظ رہنے کی کوئی تصریح نہیں ہے ؛ ہاں ایسا ہے لیکن قرائن سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ گروہ ناجی ہے معذب نہیں ہے ایک بہت ہی واضح قرینہ آیت "فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ" ہے، وہ اس طرح سے ہے کہ یہ آیت ماسبق آیت "فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ" کی شرح وتفسیر ہے یعنی اصلاح کی دعوت وتذکیر پر دو قسط میں عذاب آیا پہلی قسط میں جو عذاب آیا تھا وہ ہلکے درجہ کا تھا ہو سکتا ہے کہ فقر وفاقہ کا عذاب رہا ہو جیسا کہ باساء وضراء میں قوموں اور جماعتوں کو مبتلا کرنے کا قانون ہے اور اس کا ذکر قرآن پاک میں بہت سے مواقع پر ہے لیکن جب اس سے آنکھ نہ کھلی ہو اور ان کی مدہوشی اور سرمستی اسی طرح قائم رہی ہو تو عذاب کی دوسری قسط ان پر نازل ہوتی ہو اور دونوں عذاب کی پہلی قسط کی زد میں احکام سبت کی بے حرمتی کرنے والے ہی آئے اس پر دور اور قریب کا کوئی قرینہ موجود نہیں کہ عذاب کی پہلی قسط کی زد میں مُعْتَدِينَ فِي السَّبْتِ کے ساتھ افہام وتفہیم کو کار عبث سمجھنے والے بھی آئے ......

اور دوسرا قرینہ یہ ہے کہ مبتلائے عذاب ہونے کے جو وجوہ بتائے گئے

ہیں ان کا انطباق کسی طرح بھی " لم تعظون قوما اللہ مہلکہم او معذبہم عذابا شدیدا " کہنے والے گروہ کے حال پر نہیں ہو رہا ہے، عذاب میں آنے کی ایک علت یہ بتائی گئی ہے کہ انہوں نے ظلم کیا دوسرے یہ کہ فسق ان کے رگ و ریشہ میں رچ بچ گیا تھا، ظاہر ہے کہ ان دونوں برائیوں سے " لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاً اللّٰہُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا " کہنے والے گروہ کا دامن پاک معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ نیک ہیں، نیکی اور بدی کا شعور رکھتے ہیں قوموں اور جماعتوں کے رفع و خفض کو قانون الٰہی کے تحت تصور کرتے ہیں نیز ان کا یہ فقرہ " اَللّٰہُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا " پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ کوئی منظم سنجیدہ جماعت ہے اور اسے مُعْتَدِيْنَ فِي السَّبْتِ کے احوال سے پوری واقفیت ہے اور اس واقفیت کا مدار سنی سنائی باتیں نہیں ہیں بلکہ خود اس نے عملی میدان میں گامزن ہو کر انہیں حدود اللہ کی بے حرمتی سے روکا ہے اور بار بار روکا ہے اور پھر عاجز آ کر بیٹھ گئی ہے اور انہیں خدا کے حوالے کر دیا ہے جس طرح ایک ڈاکٹر کسی مزمن مریض پر اپنے تجربات صرف کرے لیکن کوئی فائدہ نہ ہو اور مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ ٹھیک اسی طرح اس گروہ نے انتھک کوشش کر کے دیکھ لیا تھا کہ اس میں سدھرنے کی ذرا بھی صلاحیت باقی نہیں رہی اور اس کے لئے کوشش بیکار ہے، نیز ان کے اس فقرہ " اَللّٰہُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا " سے یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ وہ کلی طور پر مایوس ہو چکے اور جس عذاب الٰہی کے بھڑکنے کا انہیں انتظار تھا انہوں نے اپنی حقیقت بین نگاہوں سے دیکھ لیا تھا کہ یہ بہار جماعت نشانہ بنے گی اور آج نہیں تو کل عذاب کی زد میں آئے گی رہی یہ بات کہ حدود اللہ کی بے حرمتی ہوتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہنا جرم ہے تو واقعہ ہے کہ منکر پر نکیر نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے اور تعاون علی الاثم کے ہم معنی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کس لفظ سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے حدود اللہ کی بے حرمتی کرنے والوں کے فعل پر نکیر نہیں کی اور مجرمانہ خاموشی اختیار کی، یہ دعویٰ بالکل بے ثبوت ہے لیس "اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ" میں دونوں گروہ داخل ہیں فرق ان دونوں میں صرف یہ تھا کہ وہ لوگ جو اس بستی کی اصلاح میں کوشش کر رہے تھے وہ اپنا فرض تذکیر ادا کر رہے تھے اور اس وقت تک ان کی اصلاح سے کلی طور پر مایوس نہ تھے۔ چنانچہ "لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ" کے ٹکڑے سے امید کی جھلک صاف نکل رہی ہے اور جو لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ انہیں سمجھانے سے کیا حاصل وہ اپنا فرض تذکیر ادا کر چکے تھے اور ان کی اصلاح پذیری سے قطعی مایوس تھے اور انہیں نہ اب اپنا ایک لمحہ ان پر صرف کرنا گوارا تھا اور نہ یہی چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا ان پر تجربہ کرے کیونکہ انہیں اس جماعت کے متعلق یقین تھا کہ اس کی نگاہوں میں دنیا کی مرغوبات اس درجہ کھب گئی ہیں۔ کہ وہ ایسی باتیں سن ہی نہیں سکتے جو اس کی لذتوں پر

اثر انداز ہوں چنانچہ نتیجہ وہی ہوا جس سے پہلے ہی انہوں نے انہیں مطلع کر دیا تھا رہا یہ کہ تذکیر برائے تذکیر نتائج سے قطع نظر ہیں دعوت میں سرگرم رہنا چاہئے یہ صحیح نہیں مصلح کے لئے حالات اور مخاطب کا لحاظ نیز نتائج پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے بلکہ حالات کے تقاضا سے ایک جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت کو خطاب کرنا بعض وقت ضروری ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ " لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ " کہنے والے گروہ نے حدود اللہ کی بے حرمتی پر مجرمانہ خاموشی اختیار نہیں کی کہ وہ عذاب کی زد میں آتا بلکہ ان کا ایسا کہنا ان کی اصلاح سے مایوسی کی بنا پر تھا، آیت کا اسلوب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ مایوسی یوں ہی نہ تھی بلکہ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ تھی چنانچہ نتیجہ ہوا بھی ویسا ہی جیسا انہوں نے کہا تھا تو پھر اس جماعت کا شمار ظالموں میں کیوں کر ہو سکتا ہے اور عذاب کی زد میں وہ کیونکر آ سکتی ہے اور رہ گئی سورۂ انفال کی آیت " وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا الآیہ (۲۵) تو خدا نے چاہا تو ہم اس سے کسی موقع پر بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس کا وہ مفہوم نہیں جو لیا جا رہا ہے، رہ گئی حدیث تو وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن اس آیت کے تحت اسے لانا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ ایسے حالات کے لئے ہے جب سوسائٹی اس درجہ بگڑ جائے کہ منکر پر عام طور سے لوگ مجرمانہ خاموشی اختیار کر لیں اور منکر کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ ہو۔ یہاں تو

حدود اللہ کی بے حرمتی پر نکیر کرنے والی ایک جماعت کے موجود ہونے کا صاحب ترجمان القرآن کو بھی اعتراف ہے پھر اس سے اس امر پر بیان کیونکر استدلال ہو سکتا ہے؟

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی

قرآن مجید کے ایک طالب علم اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آیات "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝" (انفال) کی تاویل میں جو روایات کتب تفاسیر و احادیث میں منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ پر مختلف وجوہ سے عتاب ہوا کیا واقعۃً ایسا ہی ہے؟"

قبل اس کے کہ آیات مسئول عنہا کی صحیح تاویل کی جستجو کی جائے مناسب ہوگا کہ وجوہ عتاب معلوم کر لیا جائے تاکہ حقیقت کا سراغ لگانے میں آسانی

ہو، جو روایتیں تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں ان آیات کے تحت نقل کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے عتاب کی حسب ذیل وجہیں نکلتی ہیں۔

(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر سے مدینہ آکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ صحابہ کبار کو جمع کرکے اسیران بدر کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا، مختلف جانب سے مختلف صدائیں آئیں، صدیق اکبرؓ نے فرمایا "اے رسول اللہ یہ اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیجئے ممکن ہے آگے چل کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں" لیکن فاروق اعظمؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا دین کے معاملہ میں اپنے اور پرائے کی تمیز نہیں کرنی چاہیے چنانچہ انہوں نے تمام قیدیوں کے قتل کر دینے کا مشورہ دیا اور "اس طرح کہ علیؓ عقیل کی گردن ماریں اور حمزہؓ عباس کی اور میں فلاں کو جو میرا قریبی عزیز ہے تہ تیغ کروں تاکہ کفر و شرک کے بڑے بڑے ستون ڈھے جائیں اور مسلمانوں کو اطمینان کامل نصیب ہو" آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی بے پایاں رحمت و رافت کی بنا پر صدیق اکبرؓ کا مشورہ پسند فرمایا اور اسی کے مطابق قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس (قتل نہ کرنے) پر یہ عتاب آمیز آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ، جس کی وجہ سے پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ رو پڑے۔

(۲) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے پر ہوا اس لئے کہ غزوہ بدر تک اس کی اباحت کا فتویٰ نازل نہ ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا یہ فعل چونکہ عجلت پر مبنی تھا اس لئے وحی الٰہی نے بلا تاخیر ان الفاظ میں تنبیہ کی۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

(۳) متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عتاب مال غنیمت لوٹنے پر ہوا اس لئے کہ اس سے پہلے مال غنیمت کسی نبی کی اُمت کے لئے کبھی حلال نہ تھا اور آپ کے متبعین نے بغیر اس کے کہ مال غنیمت کی حلت کا فتویٰ نازل ہو مال غنیمت لوٹا اور اسے اپنے مصرف میں لائے بعد کو ان الفاظ میں اس کی اباحت نازل ہوئی۔

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِلَىٰ آخِرِهِ

یہ تینوں عتاب کی وجہیں سلف سے آیات ۶۷،۶۶ کے تحت منقول ہیں طوالت سے بچنے کے لئے ہم نے صرف تفسیروں کا خلاصہ پیش کرنے پر کفایت کی ہے جسے تفصیل مطلوب ہو اسے کتب تفسیر میں سے خصوصیت کے ساتھ ابن جریر کی طرف مراجعت کرنی چاہئے۔

اب ہمارے لئے دو ہی راہیں ہیں یا تو ان تینوں مذکورہ بالا شان نزولوں کو بلا چون وچرا تسلیم کرلیں یا پھر ان روایات واقوال کو جن سے یہ شان نزول مترشح ہوتے ہیں۔ انہیں اصول تحقیق پر پرکھا جائے، آسان راہ پہلی ہے لیکن اہل تحقیق

کی رائے کے برابر خلاف ہے اس لئے ہم ان روایات کو محدثین کے اصول پر جانچنے اور اس کے لئے چند اصول مسلمہ انہیں کے منقول کرتے ہیں ملاحظہ ہو:۔

قَالَ ابْنُ الْجَوْزِی کُلُّ حَدِیْثٍ رَأَیْتَہٗ	ابن جوزی فرماتے ہیں کہ ہر وہ حدیث جسے عقل
یُخَالِفُ الْعُقُوْلَ اَوْ یُنَاقِضُ الْاُصُوْلَ	یا اصول مسلمہ کے خلاف دیکھو تو جان لو کہ وہ
فَاعْلَمْ اَنَّہٗ مَوْضُوْعٌ فَلَا یُتَکَلَّفُ	موضوع ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت
اِعْتِبَارُہٗ اَیْ لَا نَعْتَبِرُ رُوَاتَہٗ وَلَا	نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر اسی طرح
تَنْظُرُ فِیْ جَرْحِھِمْ اَوْ یَکُوْنُ مِمَّا یَدْفَعُہُ	وہ حدیث بھی قابل اعتبار نہیں جو محسوسات
الْحِسُّ وَالْمُشَاھَدَۃُ اَوْ مُبَایِنًا لِنَصِّ	اور مشاہدہ کے خلاف ہو یا وہ حدیث جو کتاب
الْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ الْمُتَوَاتِرَۃِ وَ	اللہ یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے مخالف
الْاِجْمَاعِ الْقَطْعِیِّ حَیْثُ لَا یَقْبَلُ	ہو اور جس میں تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔
شَیْئٌ مِّنْ ذَالِکَ التَّاوِیْلَ[۱] الخ	

امام ابن جوزی کے کہنے کا منشا یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت قابل اعتبار نہ سمجھی جائے گی۔

۱۔ جو روایت صراحۃً عقل کے خلاف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے منافی ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدات کے مخالف ہو

۴ وہ حدیث جو قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور

[۱] فتح المغیث بحوالہ سیرت

اس میں تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

ملا قاری نے بھی اپنی مشہور کتاب موضوعات کے اختتام میں حدیثوں کے جانچنے کے چند اصول بیان کئے ہیں۔

چونکہ ان کے اور امام ابن جوزی کے اصولوں میں تقریباً توافق ہے۔ اس لئے ان کے اصولوں کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے ہاں جسے تفصیل کی ضرورت ہو اسے ان کی اس تصنیف کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

امام ابن جوزی نے ساقط الاعتبار ہونے کے وجوہ میں سے یہ دو وجہیں جو بیان کی ہیں کہ روایت کتاب اللہ اور عقل کے معارض ہونے کی صورت میں قابل اعتبار نہ ہوگی یہ دونوں اصول صحابہ کے عہد مبارک سے معمول بہ ہیں، بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تو انہیں دونوں اصولوں کی بنا پر متعدد روایات کی صحت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، اپنے اس دعوی کو مدلل کرنے کے لئے دونوں کی چند مثالیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں پہلے ہم وہ مثالیں نقل کرینگے جن سے معلوم ہوگا کہ صحابہ نے بہت سی روایات کا اس بنا پر انکار کیا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے منافی تھیں

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور بعض صحابہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

إِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ مردہ پر اسکے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضہ کے سامنے جب یہ روایت بیان کی گئی تو اس کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا آنحضرت صلعم نے یہ نہیں فرمایا۔ واقعہ اتنا ہے کہ ایک دن آپ ایک یہودیہ کے جنازہ پر گزرے اس کے رشتہ دار اس پر واویلا کر رہے تھے آپ نے فرمایا یہ رو رہے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے اس کے بعد کہا قرآن تمہارے لئے کافی ہے خدا فرماتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کوئی (نفس) دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

دیکھئے حدیث چونکہ صریح نص کتاب کے خلاف تھی اس لئے حضرت عائشہ رضہ نے اسے قبولیت کا درجہ نہ دیا

(۳) اسی طرح غزوہ بدر میں مقتولین قریش کے مدفن پر کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا:

هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا سچ پایا نا؟

اس پر صحابہ نے (ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضہ نے) عرض کیا یا رسول اللہ آپ مردوں کو پکارتے ہیں حضرت ابن عمر رضہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَا يُجِيْبُوْنَ تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے لیکن وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔

حضرت عائشہ رضہ سے جب یہ روایت بیان کی گئی تو انہوں نے کہا آپ نے یہ نہیں بلکہ یہ ارشاد فرمایا۔

اِنَّهُمْ لَيَعْلَمُوْنَ الْاٰنَ مَا كُنْتُ اَقُوْلُ لَهُمْ حَقٌّ — وہ اِس وقت یقینی جانتے ہیں کہ میں ان سے جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا۔

اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ۔ — اے نبی تم مردوں کو اپنی دعوت نہیں سنا سکتے اور نہ قبر والوں کو

(۳) ایسے ہی حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے خدا کو دو بار دیکھا۔ مسروق تابعی نے حضرت عائشہؓ سے جا کر پوچھا اماں جان! کیا محمد صلعم نے خدا کو دیکھا تھا حضرت عائشہؓ نے کہا تم نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے جس نے تم سے یہ کہا ہے وہ جھوٹا ہے اور یہ آیتیں پڑھیں۔

(۱) لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ — نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ اور وہ لطیف خبیر ہے۔

(۲) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔ — کسی بشر میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اس سے بغیر ذریعہ وحی یا پردہ کے اوٹ کے باتیں کر سکے۔

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن کی حضرت عائشہؓ نے قرآن کے خلاف پا کر تردید کی ہے ہم نے خوف طوالت کی بنا پر چند ہی مثالوں پر کفایت کی ہے۔

اب ہم وہ مثالیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ صحابہؓ نے بہت سی روایتوں

کو خلاف عقل پاکر رد کر دیا۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز کو آگ چھو دے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وضو میں گرم پانی بھی استعمال نہ کرنا چاہیئے حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا اے بھتیجے جب تم آنحضرت کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو (ترمذی)

دیکھیئے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے مذکورہ بالا روایت کو خلاف عقل پاکر اس کی بابت کیسا عقلی معارضہ کیا ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو آپ نے اس کو کتاب اللہ اور عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے قبولیت کا درجہ نہ دیا اور یہ آیت پڑھی۔

لاتزر وازرۃ وزر اخرٰی — کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

امام ابن جوزی وغیرہ نے صحابہ کرام اور بالخصوص حضرت عائشہؓ کے اجتہادات سے تحقیق روایت کے جو اصول مستنبط کئے ہیں وہ کتابی ہی نہیں ہے بلکہ محدثین میں بھی ایک ایسا گروہ رہا ہے جو بعض روایتوں کو عقل یا نص کتاب کے مخالف ہونے کی وجہ سے تسلیم کرنے میں تامل کرتا رہا ہے گو ان کے رواۃ کتنے ہی ثقہ اور مستند کیوں نہ ہوں، اطمینان کے لئے چند مثالیں اس کی ہم بیان

مدح کرتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے
حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا۔

اِقْضِ بَیْنِیْ وَبَیْنَ هٰذَا الْکَاذِبِ	میرے درمیان اور اس جھوٹے گنہگار دغاباز خائن
الْآثِمِ الْغَادِرِ الْخَائِنِ (مسلم کتاب الجہاد)	کے درمیان فیصلہ کیجیے۔

چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے تھے اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیئے۔

۲۔ صحیح بخاری میں ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا حافظ ابن حجر جیسے شخص اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

وَیُشْکِلُ عَلٰی هٰذَا مَا یُوْجَدُ الْاٰنَ	اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں
مِنْ آثَارِ الْاُمَمِ السَّالِفَةِ کَدِیَارِ ثَمُوْدَ	کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم
فَاِنَّ مَسَاکِنَهُمْ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّ قَامَاتِهِمْ	ثمود کے مکانات ان سے ثابت ہوتا ہے کہ
لَمْ تَکُنْ مُفْرِطَةَ الطُّوْلِ عَلٰی حَسَبِ مَا	ان کے قد اس قدر لمبے نہ تھے جیسا کہ ترتیب
یَقْتَضِیْهِ التَّرْتِیْبُ السَّابِقُ وَلَمْ	سابق سے ظاہر ہوتا ہے اور اب تک اس
یَظْهَرْ اِلَی الْاٰنَ مَا یُزِیْلُ هٰذَا	کا کوئی حل ظاہر نہ ہوا۔
الْاِشْکَالَ (فتح الباری)	

الغرض یہ دونوں اصول ایسے ہیں جو صحابہؓ کے عہد سعید سے لے کر محدثین تک

روایات کے جانچنے کا ذریعہ سب سے ہیں جو روایت بھی ان کے خلاف بڑی محدثین نے بلا رو رعایت اسے مردود ٹھرایا۔ اس کی تائید میں مثالیں اور پیش کی جا چکی ہیں۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اب انہیں اصولوں پر ان روایات (جن سے آیات مسئول عنہا میں عتاب کے مذکورہ بالا وجوہ ترشح ہوتے ہیں) کو پرکھتے ہیں۔

ہم نے ان تمام روایات کو (جن سے عتاب کی صورتیں نکلتی ہیں) مذکورہ بالا اصولوں کی کسوٹی پر کسا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نہ تو وہ قرآن ہی کے معیار پہ پوری اترتی ہیں اور نہ عقل ہی کے۔ اب ہم وہ آیات اور عقلی وجوہ مذکورہ عتابوں کے خلاف ہیں ترتیب وار نقل کرتے ہیں۔

(۱) نص کتاب کے خلاف ہیں۔

خداوند تعالیٰ کا یہ دستور ہے کہ رسالت کے لئے وہ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل ہوا کرتے ہیں اس لئے وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں رضاء الٰہی کے لئے کرتے ہیں ان کا کوئی قدم غلط راہ میں نہیں اٹھتا بسا اوقات تو اپنے فریضہ کی ادائیگی میں اس درجہ غلو کر جاتے ہیں کہ خدا کو لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ کے محبت آمیز عتاب سے روکنا پڑتا ہے، اس قسم کے محبت آمیز عتاب قرآن شریف میں بہت سے مواقع پر ملتے ہیں مثلاً وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ، إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ، مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ، لیکن دراصل یہ عتاب

نہیں بلکہ پایہ کے لکھے ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عام لوگوں نے ان آیات کو دوسرے معانی میں لیا ہے جو کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ایسے ہی آیات مسئول عنہا میں عتاب کا پہلو نکالنا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی بیشمار آیات اس کے معارض ہیں ملاحظہ ہو۔

(۱) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (طور) — امر الٰہی پر ثابت قدم رہو بیشک تم ہماری نگرانی میں ہو

(۲) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ الآیہ (جن) — اس کو علم غیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو نہیں چڑھاتا بجز اس کے جسے اس نے رسالت کے لیے منتخب کر لیا ہے اس کے آگے پیچھے محافظ چلاتا ہے کہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ انہوں (رسول) نے اپنے رب کے پیغاموں کو بندوں تک پہنچایا

(۳) لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ) — خدا کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ نبی خدا کے اشارہ پر چلتا ہے۔
اس کی تمام حرکات و سکنات خدا اور مقربین خاص کی نگرانی میں ہوتی ہیں، اگر نبی فریضہ تبلیغ و ارشاد میں غلو کر جاتا ہے تو اسے محبت آمیز تنبیہ کے ذریعہ روک دیا جاتا ہے، بالفرض اگر نبی سے کوئی اجتہادی غلطی ہو بھی گئی تو اس پہ عتاب کے کوئی معنی نہیں، اس لیے کہ نبی کو علم غیب تو ہے نہیں اور بغیر راہ صواب دکھائے کسی غلطی پر عتاب تکلیف ما لا یطاق ہے لیکن ہم تو ثابت کریں گے کہ نبی

سے اس مقام (اسیران بدر کے بارے میں) پہ کوئی چوک نہ ہوئی، نبی نے تو ٹھیک علم الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا۔

(۲) عتاب کے تمام وجوہ مذکورہ خلاف عقل ہیں۔

(۱) اگر عتاب قتل نہ کرنے پہ ہوا جیسا کہ سلف میں سے بعض بزرگوں کا خیال ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مذہب اسلام جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سارے عالم کے لئے رحمت بن کر آیا ہے کچھ غلط سا ہے اور مخالفین کا یہ لغا رہ قوی ہے کہ جب تک اسلام مکہ میں کس مپرسی کے عالم میں تھا اس وقت تک تو رہا لیکن مدینہ میں آتے ہی جب ذرا اسے طاقت حاصل ہو گئی تو اس نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا بالخصوص بدر کی لڑائی میں تو اسلام کی کتاب میں اسیران بدر کے لئے رہائی کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

(۲) اگر عتاب فدیہ لینے پر ہوا جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے اور سبب عتاب یہی ہے کہ آنحضرت صلعم اور صحابہ نے اسے قبل از وقت حلال سمجھ لیا حالانکہ فدیہ کا مال اس وقت تک جائز نہ ہوا تھا تو سوال یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی بابت کوئی تصریح تھی یا نہیں؟ اگر نہیں تھی تو اس پہ عتاب کے کوئی معنی نہیں اور یہ ثابت ہے کہ اس بارے میں کوئی تصریح نہ تھی روایتیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

(۳) اسی طرح اگر سبب عتاب مال غنیمت کا لوٹنا ہے تو اس میں بھی وہی حکمت

پڑے گی اور سوال یہ ہوگا کہ جب اس کی علت علم الٰہی میں مقدر ہو چکی تھی۔ (جیسا کہ روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں) تو اس پر عتاب کے کیا معنی؟

سابق تصریحات سے ثابت ہو گیا کہ آیات مستفسر عنہا کے تحت جسقدر بھی شان نزول بیان میں آئی ہیں ان میں سے کوئی بھی نہ تو نقل ہی پورا اترتا ہے اور نہ عقل ہی پر، یہ تو ممکن نہیں کہ یہ تمام کی تمام روایات ناقابلِ اعتبار ہوں اس لئے کہ ان میں سے بعض نے صحاح میں بھی جگہ پائی ہے لیکن جرأت کر کے یہ ضرور کیا جائے گا کہ ان میں سے بعض روایتیں راویوں کی بے احتیاطی کی شکار ہو گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اس روایت کو سامنے رکھئے جسمیں آنحضرت صلعم کا صحابہ سے مشورہ طلب کرنا مذکور ہے، یہ مشورہ تو اپنی جگہ بہت ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ حکم تھا "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" لیکن اس روایت کا آخری ٹکڑا صحیح نہیں معلوم ہوتا جس میں آنحضرت صلعم اور صدیق اکبرؓ کے رو پڑنے اور آپ کے سامنے مثالی عذاب کے پیش ہونے کا تذکرہ ہے، اس ٹکڑے کی تضعیف تو علامہ ابن حزم ظاہری نے بھی اپنی کتاب ملل ونحل میں محدثانہ طور پر کی ہے ملاحظہ ہو:-

اما الخبر الذی فیہ لقد عرض علی عذابکم ادنی من ہذہ الشجرۃ ولو نزل عذاب ما نجا منہ	رہا وہ ٹکڑا جس میں مذکور ہے کہ مجھ پر اس درخت کے قریب تر عذاب پیش کیا گیا اگر وہ نازل ہو جاتا تو بجز عمرؓ کے اور کسی کی بھی خیریت

اِلَّا عُمَرُ فَهٰذَا خَبَرٌ لَا يَصِحُّ لِاَنَّ	ترجمہ یہ روایت صحیح نہیں اس لئے کہ عکرمہ
الْمُنْفَرِدُ بِرِوَايَةِ عِكْرِمَةَ بْنَ	بن عمار یمامی اس کی روایت میں منفرد
عَمَّارَ الْيَمَامِيَّ وَهُوَ مِمَّنْ قَدْ صَحَّ	ہیں اور یہ بزرگ ان لوگوں سے ہیں جن
مِنْهُ وَضْعُ الْحَدِيْثِ وَسُوْءُ الْحِفْظِ الخ	پر وضع حدیث اور سوء حفظ دونوں کا
(ملل ونحل)	الزام ثابت ہو چکا ہے۔

رہیں وہ روایتیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لینے پر عتاب ہوا ان میں کا وہ حصہ جس میں مال غنیمت کی حرمت مذکور ہے وہ تو صحیح ہے اس لئے کہ روایات اور تورات وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اور قوموں کے لئے اس قسم کی رقمیں ممنوع تھیں لیکن انہیں یہاں پر چسپاں کرنا صحیح نہیں ہے بخاری شریف میں آپ کے خصائص کے سلسلہ میں مال غنیمت کی حلت کا بیان ضرور ہے لیکن اس واقعہ کا متعلق ذکر نہیں۔ واللہ اعلم۔

اب ہم آیات مسئول عنہا کی صحیح تاویل پیش کریں گے لیکن اس کے سمجھنے کے لئے ایک نہایت ضروری اصول بیان کر دینا مناسب ہوگا جس کی طالب قرآن کو ہر ہر قدم پر ضرورت ہے اور جس کے بغیر بعض مواقع پر سخت دھوکا کھانے کا اندیشہ ہے۔

[ایک ضروری اصول] یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ ہر بات کا کوئی نہ کوئی موقع ومحل ہوتا ہے خواہ کوئی کلام ہو جب تک اس پر موقع ومحل کی رعایت کے ساتھ غور نہ کیا جائے گا۔

اس کا سمجھ میں آنا ممکن نہیں، یہ زحمت تو انسانوں کے کلام میں بھی ہوتی ہے دیوان عرب کا ایک ایک شعر کیوں چیستان بن گیا؟ اس کی محض یہی وجہ ہے کہ بلا موقع محل کے ان پر غور کیا گیا۔ اور شرحیں لکھ دی گئیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جو سوال مقدر کے جواب میں واقع ہیں جن مواقع پر سوالات مذکور ہیں وہاں تو کوئی زحمت نہیں لیکن جن مقامات پر سوالات مقدر ہیں وہاں طالب قرآن کو جوابات سے سوالات مقدرہ کی تعیین کرنی چاہیئے۔ ورنہ ان آیات کو ٹھیک نہیں سمجھ سکتا مثلاً اگر کوئی آیت وَاِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (طور) میں جو سوال مقدر ہے اس سے واقف نہ ہو تو وہ اس آیت کو پڑھ کر ضرور ہنس دے گا کہ خدا نے یہ کیا بات کہہ دی؟ اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآن میں ہیں خوف طوالت مانع نہ ہوتا تو اس پر تفصیل بحث کی جاتی۔ ہمارے خیال میں آیات مسئول عنہا کی تاویل میں اتنے اختلاف کی یہی وجہ ہے کہ اس اصل کی رعایت نہیں کی گئی، اگر یہ اصول ملحوظ ہوتا تو کم ازکم سبب عتاب میں اختلاف نہ ہوتا اب ہم اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیات مسئول عنہا کی تاویل کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ آیات چند در چند سوالات کے جواب میں واقع ہیں وہ یہ ہیں کہ یہود کو مسلمانوں سے سخت عداوت تھی وہ اسلام کو اپنے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے کرتے،

کبھی کہتے نبوت ورسالت تو بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہے، کبھی کفار کو یوں سبق پڑھاتے کہ آج تک جتنے انبیاء گذرے ہیں سب کے ہاتھوں معجزات وخوارق کا ظہور ہوا ہے ذرا اس مدعی نبوت سے کوئی معجزہ مانگو تو اگر واقعی اپنے دعویٰ رسالت میں سچا ہوگا تو کوئی نہ کوئی معجزہ دکھلائے گا ورنہ اس کے ادعائے رسالت کا پول کھل جائیگا۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ
الآیہ (انعام ۱۵۰)

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اس وقت تک ایمان لانے کے نہیں جبتک اسی طرح کے نشانات جو انبیاء سابقین کو دیئے گئے ہیں ہمیں بھی نہ دیئے جائیں۔

کبھی خود ہی عوام کو بھڑکانے کے لئے آپ سے معجزہ طلب کرتے ملاحظہ ہو۔

قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ
(القصص)

وہ کہتے ہیں کیوں نہیں جس طرح موسیٰ کو نشانات دیئے گئے اسے بھی دیئے جاتے، مگر کیا اس سے پہلے وہ ان آیتوں کا بھی انکار نہیں کر چکے ہیں جو موسیٰ کو دی گئیں

الغرض مذہب اسلام کے خلاف انہوں نے ہر طرح کی تدبیریں کیں، بہت سے تو اسلام کو مٹانے کے لئے دوست نما دشمن بن گئے غزوہ بدر جو تاریخ اسلام کی پہلی لڑائی ہے اس کے بھی درپردہ وہی محرک تھے۔

لیکن جب کفار کو شکست فاش ہوئی اور یہ لڑائی بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے

سے صاعقۂ ہلاکت ہوتی آب زلال ثابت ہوئی تو یہود جل مرے، چنانچہ ان میں سے بعضوں نے کہا بھی کہ ہم سے مقابلہ پڑا ہوتا تو دکھلا دیتے، اس شکست کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ یہود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے لیکن سیلاب اسلام کا بڑھتا ہوا سیلاب کیسے دیکھ سکتے تھے، اب انہیں کفار کو از سر نو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا اس لئے ایک نہایت موثر تدبیر سوچی اور اپنی تقریر کو اس قالب میں ڈھال دیا کہ نبی تو سراپا رحمت ہوا کرتا ہے مگر یہ نور رسالت کے بھیس میں لوگوں کو قتل کرنے اور لوٹنے ہی میں رہتا ہے۔ بھلا نبی کی شان کے یہ مناسب ہے؟ آیات مسئول عنہا میں انہیں سوالات مقدرہ کا جواب دیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو قصر نبوت کی آخری اینٹ ہیں انہیں چھوڑو اس جماعت قدسی کا تو ایک ایک فرد اس سے کہیں ارفع ہے کہ قید و بند کرے۔ قتل و خونریزی تو بہت دور کی چیز ہے اور اس ملکوتی گروہ میں سے کوئی بھی اس خاکدان عالم میں ملوکیت کے لئے نہ آیا تھا بلکہ سب کے سب ارض الٰہی سے شر و فساد دور کرنے آئے تھے اس لئے ہر ایک نے احقاق حق اور ابطال باطل میں جادلہم بالتی ہی احسن پر عمل کیا ہے لیکن جب پرستاران باطل نے اپنی پوری طاقت سے حامیان حق پر حملہ کیا ہے تو انہوں نے حق کے لئے جنگ کی ہے، اس میں قید و بند کی نوبت بھی آتی ہے قتل و خونریزی کی بھی لیکن ایسا ملوکیت پرستی کی بنا پر نہیں ہوا ہے بلکہ حق کی خاطر، یہ تو تمہارا شیوہ ہے کہ متاع دنیا کی ہوس میں اپنا ایمان و ضمیر سب قربان کر دیتے ہو اور طلب دنیا

میں ایسی شرمناک صورتیں اختیار کر رکھی ہیں کہ اگر سنت اللہ مانع نہ ہوتی تو زمین شق ہو جاتی اور تم ہمیشہ کے لئے اس میں سما جاتے اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہود کی مسلمانوں کے خلاف تگ و دو کی اصلی وجہ دینی و دنیاوی رسوخ کا تحفظ تھا اس کے بچاؤ کے لئے باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلعم مبعوث من اللہ ہیں انکار کرتے تھے، انکار ہی نہیں لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے بھی تھے اسی ذلیل مقصد کے لئے یہ فتنہ کھڑا کیا گیا تھا اس پر خدا نے انہیں سخت ڈانٹ بتائی۔ گو بظاہر خطاب کفار سے ہے۔ لیکن درپردہ یہودیوں پر ضربیں لگائی ہیں اس لئے کہ تمام فتنوں کا سرچشمہ وہی تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیات مسئول عنہا کے الفاظ سے بھی ہماری تاویل نکلی ہے یا نہیں اس کے لئے ضرورت ہے کہ کلمات ذیل کی تحقیق کی جائے۔

حتیٰ سبحٰن تریدون عرض الدنیا کتاب، فیما اخذتم

(۱) حتیٰ۔ لفظ حتیٰ ہمارے نزدیک یہاں ترقی کے مفہوم پر مشتمل ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام عرب میں یہ اس معنی میں آتا بھی ہے یا نہیں، چونکہ جو معنی ہم لے رہے ہیں عام لوگوں کے نزدیک غریب ہے اس لئے اس کی تائید میں کلام عرب سے چند شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

فرزدق کہتا ہے

فیا عجبا حتی کلیب تسبنی   کان اباھا نھشل او مجاشع

حیرت ہے کہ قبیلہ کلیب تک میرے منہ لگ رہا ہے گویا اس کا جد امجد نہشل ہے یا مجاشع ہے۔

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

القی الصحیفۃ کی یخفف رحلہ — والزاد حتی نعلہ القاھا

اس نے صحیفہ اور توشہ زمین پر ڈال دیا تاکہ — اثاثہ کم ہو جائے حتیٰ کہ نقش پا تک گرا دیا۔

(۲) "تریدون عرض الدنیا" ہم کہہ چکے ہیں کہ آیات مسئول عنہا سوالات مقدرہ کے جواب میں واقع ہیں بالفاظ دیگر یہ آیات یہودیوں کی حماقتوں کا دندان شکن جواب ہیں اس لئے تریدون کا خطاب ہمارے نزدیک بظاہر تو کفار کی جانب ہے لیکن در پردہ اصل ڈانٹ یہودیوں پر ہے اس لئے کہ وہی ان کے استاد اعلیٰ تھے، وہ جو کچھ سکھاتے تھے یہ اسے قبول کر لیتے اور یہ جواب بھی انہیں کی حماقت سے لگتا ہوا ہے اس لئے کہ دنیا میں جتنی قومیں بستی ہیں ان میں سب سے زیادہ دنیا پرست یہود قوم ہے اس نے دنیا کے پیچھے اپنے مذہب کو محرف کر ڈالا اور نہ معلوم کیا کیا ذلتیں اٹھائیں لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں اور اسی نے اس آخری رسول کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا حالانکہ ان کی کتاب (توراۃ) کا حکم تھا کہ اس کی پیروی کرو لیکن برا ہو طمع کا۔

۳۔ کتاب۔ کتاب کا لفظ قرآن میں بہت سے معانی میں آیا ہے کہیں تو اس سے آسمانی کتاب مراد لیا گیا ہے اور کہیں اعمالنامہ اور بعض جگہ لوح محفوظ کے لئے آیا ہے اس کی تعیین سیاق و سباق سے ہوتی ہے، یہاں پر کتاب سے ہمارے نزدیک سنۃ اللہ یا قانونِ الٰہی ہے جیسا کہ سورہ حجر میں اسی معنی میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا	اور ہم نے کسی بستی کو نہیں تباہ کیا مگر اس کے لئے
كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ۔	ایک قرارداد پہلے سے تھا۔

(۴) اَخَذْتُمْ، اخذ کا مفہوم ہمارے نزدیک یہاں پر "اختیار" کرنا ہے سوال یہ ہے کہ کیا لغت میں یہ معنی آتا ہے یا نہیں چونکہ عام تاویل کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مفہوم ذرا غریب ہے اس لئے اس معنی کی تائید ہم مستند لغت سے کریں گے۔

لسان العرب میں لفظ اخذ کے تحت ہے۔

والعرب تقول لو كنت منا الخذت	اہل عرب یوں کہتے ہیں اگر تم ہم میں سے ہوتے
باخذنا اى بخلائقنا وزينا وشكلنا	تو ہمارے اطوار اور طرز رہائش اختیار
وهديا۔ (لسان العرب جزء خامس)	کرتے۔

اور یہ جملہ تو عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے خذ هذا او ذاك

خلاصہ مباحث | تفصیل بالا سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ آیات مسئول عنہا کے ماتحت تفسیر کی کتابوں میں جتنے شان نزول مذکور ہیں ان میں سے ایک بھی نہ تو میزان قرآن ہی پر پورا اترتا ہے اور نہ عقل ہی پر، اور نہ موقع و محل ہی اتنے عتابوں کا متحمل ہو سکتا ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس کی اصل یہ ہے کہ آیات مسئول عنہا یہودیوں کے اعتراضات کے جواب میں واقع ہیں، ہم کہہ چکے ہیں کہ بدر کی فتح نے یہودیوں کو سراپا غیظ و غضب بنا دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے داعی اسلام اور جان نثاران محمد پہ مذہبی رنگ میں اعتراضات

کی بارش شروع کر دی چونکہ وہ صاحب کتاب تھے اور یاد عا بھی بڑے شد ومد سے کرتے تھے اس لئے ان کی پر فریب باتیں ضعفاء قلوب کے لئے تو باعث اضطراب ہوتیں اور کفّار کے لئے مزید وحشت و نفرت کا سبب۔ اس لئے وحی الٰہی نے ان کے دجل و فریب کے تمام تہ بر تہ پردوں کو چاک کر کے حقیقت بے نقاب کر دی سہولت کے لئے ہم سوالات مقدرہ اور جوابات نمبر وار نقل کرتے ہیں۔

سوالات مقدرہ

(۱) "نبی تو سارے عالم کے لئے رحمت بن کر آتا ہے لیکن یہ مدّعی نبوت تو سراپا عذاب ہے۔ دیکھتے نہیں قتل و خونریزی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

(۲) مال غنیمت اتباع محمدؐ نے جائز کر لیا ہے حالانکہ یہ مال کسی نبی کے لئے جائز نہ تھا اور ایسا تو اس نے لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے کے لئے کیا ہے۔

جوابات

(۱) قید و بند کرنا بھی نبی کے شایان شان نہیں، قتل و خونریزی تو نبی کی شان کے سراسر منافی ہے یعنی نبی تو سرتا سر رحمت ہے اور سب کو رحمت کا مجسمہ بنا دینا چاہتا ہے لیکن پرستارانِ باطل اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں چونکہ اس کے ساتھ حق ہوتا ہے اور خدا کو حق کی مظلومیت کبھی نہیں پسند ہے اسی لئے بسا اوقات عذاب الٰہی بادِ صرصر کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے اور کبھی خسف ارض کی صورت میں اور بعض اوقات خدا انھی بھر آدمیوں میں وہ عزیمت پیدا

کر دیتا ہے کہ پرستارانِ باطل کے بڑے بڑے لشکر ان کی مقاومت سے عاجز رہتے ہیں۔

(۲) اے مسلمانو! اگر ان کا یہ خیال صحیح بھی ہو کہ مال غنیمت پہلے حرام تھا تو اب وہ حلال کر دیا گیا ہے اب اس کے استعمال میں جھجک نہ ہونی چاہیے رہے ان کے اعتراضات تو اس کی پروا نہ کرو کیونکہ یہ سب حماقتیں وہ تمہاری بڑھتی ہوئی ترقی کو دیکھ کر کر رہے ہیں وہ تو تمہاری ہر روش کو خواہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو برا سمجھیں گے اسی لئے آیات مسئول عنہا کے بعد والی آیت (فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً واتقوا اللہ ان اللہ غفور الرحیم) میں مالِ غنیمت کو حلال طیب کہا یعنی یہودیوں کا اعتراض سراسر باطل ہے اور پھر واتقوا اللہ کہا یعنی مال غنیمت تو جائز ہے لیکن کہیں اس کے حصول کو کار ثواب نہ سمجھ لینا بلکہ اگر لڑائی میں مل جائے تو اس کے استعمال میں قباحت نہیں مگر اس کے لئے جنگ کرنا کبھی جائز نہیں +

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ ایذا رسانی

اور

براءت کی تحقیق

سورہ احزاب کی آیت "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوْا وَکَانَ عِنْدَ اللّٰہِ وَجِیْھًا" کی تلاوت کے وقت قرآن کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس آیت میں مسلمانوں کو کس امر میں قوم موسیٰؑ سے مشابہت اور مماثلت اختیار کرنے سے روکا گیا ہے اور ایذا کی وہ کونسی قسم تھی جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کو پہنچائی تھی۔ جس کے ارتکاب سے آخری شریعت کے پیروؤں کو منع کیا گیا ہے! اس سوال کے جو جوابات کتب تفسیر میں دیئے گئے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ پہلے انہیں پیش کر دیا جائے تاکہ سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں جو جواب اوفق ہو اُسے اختیار کیا جا سکے یا اُن کی روشنی میں کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ ذیل میں ہم اُن کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن صاحب کو تفصیل کی ضرورت ہو انہیں کتب تفسیر

کی طرف مراجعت کرنی چاہئے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حضرت موسیٰؑ بڑے شرمیلے تھے۔ غایت حیا سے اپنا جسم چھپائے رکھتے تھے اس پر بنی اسرائیل نے ان کو یوں ایذا پہنچائی کہ کہنے لگے کہ یہ بدن کو ہمیشہ (معلوم ہوتا ہے) اس لئے چھپائے رکھتے ہیں کہ ان کو برص وغیرہ کا کوئی عارضہ ہے خداوند تعالیٰ نے یہ الزام ان سے اس طرح دور کیا کہ ایک روز وہ غسل کرنے گئے اور کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے لیکن جب غسل کر چکے اور چاہا کہ کپڑے پہنیں تو پتھر کپڑے لئے لئے وہاں سے چل دیا۔ اور وہ اس کے پیچھے ثوبی حجر ثوبی حجر کہتے ہوئے دوڑے۔ آخر بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس جا کر پتھر رک گیا۔ لوگوں نے جب انہیں اس طور سے دیکھا تو ان کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ انہیں برص وغیرہ کی کوئی بیماری ہے۔

(۲) حضرت علیؓ زیر بحث آیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ پہاڑ پر چڑھ گئے اور اسی پر حضرت ہارونؑ کا انتقال ہو گیا۔ اس پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ پر یہ الزام رکھا کہ تم نے انہیں قتل کر دیا، وہ تم سے زیادہ حیادار اور نرم مزاج تھے۔ اس طرح انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو دکھ دیا۔ اس الزام کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت ہارونؑ کو لے کر بنی اسرائیل کی مجالس پر گذریں تاکہ انہیں

اس بات کا یقین آئے کہ وہ قتل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ طبعی موت مرے ہیں۔ کیونکہ اگر قتل کئے گئے ہوتے تو آثار زخم جسم پر ہوتے۔[1]

(۳) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تعال البعضہم کہہ کر حضرت موسیٰ کو ایذا دینے اور پھر اس سے انہیں بری قرار دینے کے باب میں ایک اور قول بھی نقل کیا ہے جو گو فحش ہے لیکن دل پر جبر کر کے ہم اسے یہاں نقل کر دیتے ہیں کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" وہ یہ ہے کہ قارون نے ایک بازاری عورت کو اس پر راضی کر دیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو مجلس میں علی رؤس الاشہاد حضرت موسیٰ کے متعلق کہے کہ " انہوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی ہے" چنانچہ اس کے لئے قارون نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور وقت آیا کہ وہ بہتان طرازی میں زبان کھولے لیکن عین وقت پر قدرت نے سچ کہنے کا اسے الہام کیا پس اس نے وہ بات نہ کہی جو اسے سکھائی گئی تھی بلکہ ان کی عصمت اور پاک دامنی کا علی الاعلان[2] اظہار کیا۔

یہ ہیں مذکورہ بالا روایات و اقوال جن کی روشنی میں حضرت موسیٰ کو ایذا دینے اور پھر اس سے انہیں بری ٹھیرانے کی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔

اوپر کے اقوال میں سے شروع کے دو قول ابن کثیر سے اور آخر کا تفسیر کبیر سے نقل کیا گیا ہے، امام ابن کثیر شروع کے دو اقوال نقل کر کے فرماتے

---

[1] ابن کثیر ج ۳ [2] تفسیر کبیر ج ۶۔

ہیں کہ ان میں سے ہر ایک قول کے صحیح ہونے کا احتمال ہے کہ ایذا اور پھر اس سے برأت کی کوئی اور شکل پیش آئی ہو۔

امام رازیؒ نے ایذاءِ موسیٰؑ کی اور شکلیں بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں مثلاً ان کی قوم نے "اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ" کہا اور ایک موقع پر "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" اور ایک دوسرے موقع پر "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ" کہا لیکن اس سورہ کا نظم مذکورہ بالا اقوال کی تائید میں نہیں ہے، ہاں امام رازیؒ نے جو ایک قول قال بعضھم کہہ کر نقل کیا ہے اور جسے ہم اوپر درج بھی کر چکے ہیں اس سے کچھ نوعیت ایذا کی طرف اشارہ ہوتا ہے؛ رہا یہ امر کہ اس طرح کی سازش قارون کے ہاتھوں عمل میں آئی، محتاج تحقیق ہے کیونکہ آیت کا رجحان اس طرف ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کے ہاتھوں دکھ دیا گیا۔ چنانچہ ایک جگہ اس کا شکوہ خود انھوں نے یوں کیا ہے۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (الآیہ) اور اس واقعہ کو بطور تنبیہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ دیکھو تم کہیں ان کی روش پر نہ چلنا اور نہ مان لینے کے بعد کہ قارون کے ہاتھوں حضرت موسیٰؑ کو دکھ پہنچا۔ حالات میں تطابق نہ ہو گا کیونکہ پھر اس کے معنی گویا یہ ہوں گے کہ اے مسلمانو! تم ان لوگوں (قارون اور اصحاب قارون) کی مانند

نہ ہو جاؤ جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو دُکھ دیا۔ حالانکہ بات یہ نہیں کہی ہے۔ بلکہ ایک اُمّت کی حالت دوسری اُمّت کے سامنے بطور تذکیر و تبصیر پیش کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس سورہ کا بیشتر حصہ منافقین اور کچے دل لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

ہمارے خیال میں آیت زیرِ بحث کے اس ٹکڑے "فبرأہ اللہ مما قالوا" میں نوعیتِ ایذا کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے، رہ گئی اس کی قطعی تعیین کہ کس نوع کی ایذا دی گئی تو اس کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ عدم تعیین نفسِ واقعہ کے مدعا پر اثر انداز ہے، نوعیت ایذا کے بارے میں قرینِ قیاس یہ ہے کہ قومِ موسیٰؑ میں سے بعضوں پر اس پیغمبرِ جلیل کی دعوتِ گراں گذری ہوگی اور انھوں نے آپ کو یا آپ کے متعلقین میں سے کسی کو متہم کرنے کی سازش کی ہوگی اور قدرت نے ان کی افترا پردازی فاش کر دی ہوگی۔ اور غالب قرینہ ہے کہ یہ حرکت منافقین بنی اسرائیل نے کی ہوگی۔ کیونکہ ہر پیغمبر کے عہد میں یہ مارِ آستین پلتے گئے ہیں اور انھوں نے مذہب کی آڑ میں وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ الامان و الحفیظ۔ خود رسالتِ کبریٰ کے عہد میں بھی یہ طبقہ ناہنجار ایک بڑی تعداد میں موجود تھا پیغمبرِ عالم کو حضرة عائشہ پر اتہام تراش کے ایذا پہنچانے میں یہی لوگ تھے چنانچہ سورۂ نور میں نہایت صراحت سے اس کی قلعی کھولی گئی ہے اور اس اتہام کے رد میں جو آیات وارد ہیں اس کی آخری آیت میں بھی آیت زیرِ بحث

کی طرح فبراہ اللہ، مما قالوا، کا ٹکڑا باسلوب دگر لایا گیا ہے۔ جس سے اس واقعہ کی واقعہ افک سے مماثلت پورے طور سے مفہوم ہوتی ہے اور نیز نوعیت ایذا کی طرف بھی غمازی ہوتی ہے، وہ آیت یہ ہے۔

اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثَاتِ وَ الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (نور - ۲۶)	خبیث عورتیں خبیث مردوں کیلئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کیلئے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاکدامن مردوں کے لئے ہیں اور پاک دامن مرد پاکدامن عورتوں کے لئے ہیں ان کا دامن ان کی افترا پردازی سے پاک ہے۔ ان کے لئے بخشش اور بہترین رزق ہے۔

مندرجہ بالا آیت واقعہ افک کے سلسلہ کی آخری آیت ہے، دیکھئے یہاں بھی فبراہ اللہ مما قالوا" کا ایک ٹکڑا" اولٰئك مبرءون مما یقولون" کے قالب میں موجود ہے، فرق صرف اسلوب کا ہے، نیز خود اس سورہ کی بعض اور آیات سے بھی اس طرح کی ایذا دہی کی تائید ہوتی ہے ملاحظہ ہو۔

(۱) يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ	اے نبی اپنی بیویوں سے کہدے اگر تمہیں دنیاوی زندگی اور اس کی زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تمہیں اس سے متمتع کردوں۔

وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝	اور رخصتی جوڑے دے کر نہایت خوبصورتی
فَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ	سے تمہیں رخصت کر دوں اور اگر اللہ اور
رَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ	اس کا رسول اور دار آخرت کی زندگی چاہتی ہو تو
فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ	بلاشبہ خداوند تعالیٰ نے تم میں سے احسان
مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔	والوں کے لئے بڑا اجر تیار کیا ہے ۔
(۳) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا	اے مسلمانو پیغمبر کے گھروں میں کھانے کے لئے
تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ	داخل نہ ہو مگر یہ کہ تمہیں اجازت دی جائے
يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ	نہ انتظار کرنے والے ہو اس کے پکنے کا، لیکن
نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ	جب بلائے جاؤ تو داخل ہو پس تم کھا چکو تو منتشر
فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا	ہو جاؤ اور نہ ہو بات میں جی لگانے والے
وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ	بیشک یہ چیز پیغمبر کے لئے وجہ ایذا ہے پس وہ
ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ	تم سے شرماتا ہے اور اللہ حق بات سے
فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ	نہیں شرماتا اور جب تمہیں ان سے
مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ	کچھ مانگنا ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو
مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۔ ذٰلِكُمْ	یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی طہارت کے
اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ وَمَا	زیادہ قریب ہے اور تمہارے لئے
كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ	جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو دکھ دو ۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۔	اور نہ کبھی یہ جائز ہے کہ اس کے بعد اس کی بیویوں سے نکاح کرلو بلاشبہ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے۔
(۳) اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۔	یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی پھٹکار ہے۔ اور ان کے لئے خدا نے دردناک سزا تیار کی ہے اور وہ لوگ جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایذا دیتے ہیں بغیر اس کے کہ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہو وہ بہتان اٹھانے والے اور گنہگار ہیں۔

اوپر نمبروار جو آیتیں ہم نے نقل کی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایذا کی نوعیت پر مشتمل ہے، پہلے نمبر کی آیات میں پیغمبر عالم کو ایذا پہنچانے کی نوعیت کی تصریح تو نہیں ہے لیکن آیات کے معانی پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی جانب سے کوئی نہ کوئی ضرور ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان آیات میں ان کو اتنی سخت ڈانٹ بتائی گئی ہمیں جہاں تک اس کی وجہ معلوم ہوسکی ہے یہ ہے کہ منافقین کی عورتیں ازواج مطہرات کے یہاں جاتیں اور ان کی حالت زار کا ماتم کرتیں اور طرح طرح

سے نان و نفقہ کے اضافہ کے مطالبہ پر انہیں اکساتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بعض ازواج ان کی باتوں سے متاثر ہو گئیں اور انہوں نے نان و نفقہ کے اضافہ کا مطالبہ شروع کر دیا اور اس پر یہ آیات عتاب نازل ہوئیں جن میں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ جسے دنیا کے مزے مرغوب ہوں وہ پیغمبر کے پاس سے خصتی جوڑے لے کر چل دیں اور جنہیں آخرت کی راحت مطلوب ہو وہ پیغمبر کے ساتھ تکلفت اور عسرت کی زندگی بسر کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور نیکی اور عمل صالح میں مشغول رہیں۔

برملا نہ سہی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ در پردہ پیغمبر عالم کو منافقین کی طرف سے ایذا دینے کی ایک شکل یہ بھی تھی جسے انہوں نے اختیار کیا تھا اور اس طرح کی کارروائی کرنے میں ان کو سہولت بھی تھی اس لئے کہ مسلمانوں میں پوری طرح وہ گھلے ملے رہتے تھے، باہر مرد پیغمبر عالم اور آپ کے جاں نثاروں کو دکھ پہنچانے کی تدبیریں بروئے کار لاتے اور گھروں میں ان کی بیویاں فتنے پھیلاتی پھرتی تھیں۔

دوسرے نمبر کی آیت میں خطاب کا آغاز گو "یا اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا" سے ہوا ہے لیکن حقیقت میں روئے سخن اسلامی جماعت کے کچے دلوں اور منافقین کی جانب سے جو بظاہر جماعت میں داخل تھے لیکن ان کی زندگی پر اس کا کچھ اثر بھی نہ پڑا تھا۔ نیز اس آیت میں پیغمبر عالم کے ساتھ ان کی

بعض زیادتیوں اور ایذا دہی کی طرف اشارہ نہیں بلکہ تصریح ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں کو اپنے یہاں دعوت دیتے۔ تو منافقین کھانا تیار ہونے سے پہلے ہی ازواجِ مطہرات کے یہاں پہنچ جاتے اور فساد انگیز باتیں شروع کر دیتے، ان کی عسرت اور تنگ دستی کا خوب رونا روتے اور باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ ڈالتے کہ اگر آپ لوگوں کو پیغمبر صاحب الگ کر دیں تو ہم متمول لوگوں سے آپ لوگوں کا رشتہ قائم کر دیں اور پھر اطمینان اور سکھ کی زندگی بسر ہو، یہ غضب کا افلاس آپ ہی لوگوں کا دل و جگر ہے کہ برداشت کر رہی ہیں دیکھئے کیا یہ کھلی ہوئی ایذا رسانی نہیں ہے؟

تیسرے نمبر کی آیات میں ایذاء نبی کی یہ نوعیت مذکور ہے کہ جب ازواجِ مطہرات اور دوسری مسلمان عورتیں رات میں ضرورت سے نکلتیں۔ تو ان سے منافقین مذاق کرتے اور جب ان سے اس پر باز پرس ہوتی تو یہ تاویل کرتے کہ ہم نے پہچانا نہیں۔ ہم نے سمجھا لونڈیاں جا رہی ہیں۔ چنانچہ اسی لئے ادناء جلباب کا حکم آیا تاکہ حرائر اور اماء میں تمیز ہو سکے اور شبہ میں ازواج مطہرات اور پیغمبر کی صاحبزادیاں اور مسلمانوں کی عورتیں ستائی نہ جائیں۔ یہ بھی ایذا کی ایک نہایت گھناؤنی شکل ہے جو منافقین نے اختیار کی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو ایذا دینے والے ان کی قوم کے منافقین تھے اور ایذاء کی نوعیت اسی طرح کی کوئی رہی ہو گی جو آخری پیغمبرؐ کے عہد میں منافقین نے اختیار کی، رہا تعیین کا مسئلہ تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایذا کی فلاں ہی نوعیت موسیٰ علیہ السلام کو دکھ دینے کی استعمال کی گئی کیونکہ جب اس بارے میں کچھ تصریح نہیں ہے تو جو کچھ بھی اس باب میں کہا جائے گا ظن و قیاس سے زیادہ اس کی حیثیت نہ ہو گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس واقعہ کے اس سورہ میں ذکر کا کیا مقصود ہے؟ تو اس کا مقصود بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جماعت کے کمزور اور کچے دل ممبر اس سے سبق لیں اور نافرمانی رسول سے بچیں اور رسول کی اطاعت کا سچا جذبہ پیدا کریں اور کوئی قدم بھی ایسا نہ اٹھائیں جو غلط ہو اور میثاق طاعت کے منافی ہو اور جو لوگ عہد طاعت پر قائم ہیں۔ ان کے اندر اور زیادہ جوش اور استقامت پیدا ہو۔

سورۂ صافّات کی قسمیں

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ

قرآنِ مجید کے ایک طالب علم نے سورۃ صافات کی قسموں کی غرض اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں ربط دریافت کیا ہے۔ اس باب میں قبل اس کے کہ ہم اپنی کوئی تحقیق پیش کریں مناسب ہوگا کہ مفسرین کرام کی نگاہِ کشف و تحقیق نے ہماری رہنمائی کے لئے جو نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی طرف مراجعت کر لی جائے تاکہ اصل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پیش نظر سورہ کی قسموں کی بابت یوں تو تمام مفسرین نے کچھ نہ کچھ بحث کی ہے مگر اس بارے میں حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے جس تمام و کمال سے

تحقیق و تدقیق کی ہے یہ کچھ انہیں کا حق ہے۔ فرماتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف ایک ہی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان صفات کا موصوف مختلف ہو۔ پہلی صورت میں اس کی مختلف توجیہیں ہوں گی۔

۱۔ ان صفات کے موصوف ملائکہ قرار دیئے جائیں اس لحاظ سے تاویل یوں ہو گی۔

الف۔ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا۔ یعنی قسم ہے ان ملائکہ کی جو صف بستہ ہیں۔ ملائکہ یا تو عبادتِ الٰہی کے لیے صف بصف آسمانوں میں مستعد رہتے ہیں جیسا کہ انہیں کی زبانی ارشاد ہے "وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ"۔ یا اس کا بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے صف بصف ہونے کا یہ مفہوم ہو کہ ملائکہ میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ درجہ معین ہے۔

ب۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ اس کی بھی مختلف توجیہیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہیں جو بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لئے پھرتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو الہام کی صورت سے قلوبِ انسانی میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ یا یہ کہ اس سے وہ ملائکہ مراد ہوں جو انسانوں سے ارواحِ خبیثہ کو دور کیا کرتے ہیں۔ ان اقوال کو بیان کرنے کے بعد حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ اس دوسری

صفت کے متعلق اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں۔

"فلاسفہ کے نزدیک طے شدہ ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں ایک سراپا تاثیر ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ دوسرا عالم اجسام ہے اور یہ سراپا تاثر و انفعال ہے تیسرا عالم ارواح (ملائکہ) ہے اور یہ وہ جماعت قدسی ہے جس میں کارسازِ فطرت کی طرف سے تاثر و تاثیر دونوں طرح کی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ ایک طرف تو انوارِ الٰہی سے فیض یاب ہوتی ہے اور دوسری طرف قلوبِ انسانی پر بھی اثر ڈالتی ہے۔"

ج۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہی وہ صفت ہے جس سے ملائکہ اپنی روحانیت میں ترقی دے کر عالم اجسام پر اثر ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:۔

مقدمہ بالا کی روشنی میں غور کرو تو تم پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ پہلی صفت (وَالصّٰٓفّٰتِ) میں اشارہ ہے کہ ملائکہ صف بصف خداوند تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سر نیاز خم کئے رہتے ہیں۔ اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے ملائکہ انوارِ الٰہی اور تجلیاتِ ربانی کے مہبط ہوتے ہیں۔ دوسری صفت (فَالزّٰجِرٰتِ) میں اشارہ ہے کہ جواہر ملکیہ (ملائکہ) قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسانی قویٰ ادراکیہ کے حرکت میں لانے کے ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں جو ان کی روحانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نظام قدرت کی

جانب سے اس لئے ہے کہ ارواح بشری اپنی تکمیل میں ارواح ملکیہ کی محتاج ہے اور یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ ارواح بشری کی یا تقوی طاقتوں کے بالفعل ہونے میں ملائکہ کا بہت زبردست ہاتھ ہے۔ یہ محض دعوی ہی نہیں بلکہ اس کی سند میں بے شمار دلیلیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ...

وہ نازل فرماتا ہے ملائکہ کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر بھی وہ مناسب سمجھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:-

(۲) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ

روح امین (جبریل) نے تمہارے دل پر اسے نازل کیا ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے اس آیت سے متعلق ایک اور نہایت لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

حقیقی کمال کسی چیز کو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ چیز خود مکمل و اکمل ہو۔ مکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ وہ ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہو جو اس کے شایان شان ہوں۔ اور اکمل ہونے کا یہ منشا ہے کہ اس کا فیض دوسروں تک پہنچے اور یہ مسلم ہے کہ دوسرے کی تکمیل سے مقدم خود با کمال ہونا ہے اس کے بغیر اصلاح و ارشاد بے معنی ہے۔ لہٰذا پہلی صفت میں اشارہ ہے کہ ملائکہ

اپنی تکمیل کے لئے ہمہ آن اطاعتِ الٰہی میں چیت رہتے ہیں اور دوسری صفت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ انسانی قلوب سے وہ تمام کی تمام خرابیاں دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے سراسر منافی ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ ارواحِ بشری کے انوارِ الٰہی سے مستنیر ہونے میں شریک ہیں۔

۲۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ اوصاف گروہِ انسانی پر محمول کی جائیں اور اس کی دو شکلیں ہیں:۔

(۱) وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا سے انسانوں کی وہ صفیں مراد لی جائیں جو نماز کی ادائیگی کے وقت صف بصف قائم کی جاتی ہیں اور فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا سے نمازیوں کا اعوذ باللہ پڑھنا مراد لیا جائے گویا اس کلمہ سے نمازی اپنے پاس سے شیاطین کو دور بھگاتے ہیں۔ اور فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا سے ان کا نماز میں قرآن پڑھنا مراد لیا جائے۔ دوسری صفت کی ایک اور توجیہ بھی بہت مشہور ہے وہ یہ کہ اس کا مقصود یہ ہے کہ نمازی نہایت بلند آہنگی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں۔ جس کی مصلحت شیاطین کو بھگانا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قرأت والی روایت میں یہی مصلحت مذکور ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ اس سے علماء محققین کی وہ صف بصف جماعت مراد لی جائے جو دینِ الٰہی کی تبلیغ میں منہمک رہتی ہے۔ اور دوسری صفت سے

اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اوامر نواحی میں غایت درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسری صفت میں اشارہ ہے کہ وہ دینِ الٰہی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور اتباعِ شرائع پر بھی لوگوں کو ابھارتے ہیں۔

۳۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ ان صفات کو مجاہدین (فی سبیل اللہ) پر منطبق کیا جائے یعنی پہلی صفت سے جنگ کی صفیں مراد لی جائیں اور قرآنِ پاک میں مذکور بھی ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا"۔ دوسری صفت سے یہ مقصود ہے کہ وہ اثنائے جنگ میں گھوڑوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں اور تیسری صفت سے حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میدانِ جنگ کی گرماگرمی کے وقت بھی ان کی زبانیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتیں۔

۴۔ چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہ صفات آیاتِ قرآنی کی ہیں اور اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ قرآن پاک کی آیاتِ متعدد مباحث سے متعلق ہیں۔ کچھ تو واحدانیت اور علم الٰہی پر مشتمل ہیں اور کچھ قدرت خداوندی اور حکمتِ ربانی کے بارے میں واقع ہیں۔ اور کچھ اخلاقیات وشرائع سے متعلق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ پہلی صفت میں آیاتِ قرآنی کو صف بعض اشخاص کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری صفت سے ان آیات کی جانب اشارہ ہے جو نواہی پر مشتمل ہیں۔ اور تیسری صفت ان آیات سے متعلق ہے جو اعمال خیر کے وجوب پر محرک ہیں۔

اب دوسری صورت لو یعنی یہ کہ ان صفات کا موصوف ایک نہیں بلکہ الگ الگ قرار دیا جائے۔ مثلاً پہلی صفت کے موصوف پرندے ہوں جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ہے "وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ"۔ اور دوسری صفت سے وہ تمام کی تمام چیزیں مراد لی جائیں جو معاصی کے روکنے کا ذریعہ ہوں۔ اور تیسری صفت سے (بلا تخصیص) وہ تمام کی تمام باتیں مراد لی جائیں جو کلام الٰہی میں سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس دوسری صورت کے متعلق امام صاحب فرماتے ہیں:۔

"خداوند تعالیٰ کی مخلوقات یا تو جسمانی ہیں۔ یا روحانی مخلوقات جسمانیہ کے مختلف مدارج و طبقات ہیں جن میں سرمو تغیر نہیں ہوتا مثلاً زمین وسط عالم ہے۔ اور کرہ ۔ ئی سے محیط ہے۔ پانی ہوا سے محیط ہے اور ہوا آگ سے محیط ہے۔ مزید براں یہ کہ عناصر اربعہ طبقات فلکی سے عالم اجسام کے آخری حصہ تک محیط ہیں پس عالم اجسام گویا جلال الٰہی کے سامنے صف بصف کھڑا ہے۔ رہے جواہر روحانیہ ملکیہ (ملائکہ) تو وہ باوجود اختلاف مدارج وصفات دو صفتوں میں مشترک ہیں۔ ایک تو عالم اجسام میں تاثیر و تصریف ہے جس پر یہ آیت (فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا) صریحاً دلالت کر رہی ہے اور دوسری صفت خداوند تعالیٰ کی معرفت میں استغراق ہے، چنانچہ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے چونکہ عالم اجسام درجہ میں عالم ارواح سے ادنیٰ ہے اور جسمانیات میں تصرف بمقابلہ عالم ارواح کے آسان ہے اس لئے پہلے درجہ میں عالم اجسام کو رکھا گیا اور دوسرے

درجہ میں ان ارواح طیبہ کو رکھا جو عالم اجسام پہ تصرف کرتے ہیں اور تیسرے
درجہ میں ان ارواح مقدسہ کو رکھا ہے جو ہمہ تن خدا کی تسبیح و تہلیل میں
لگی رہتی ہیں "

اس کے بعد امام موصوف نے دو ایسے گروہوں کے اقوال نقل کئے ہیں
جن میں سے ایک کا خیال ہے کہ نفس اشیاء مذکورہ مقسم بہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان اشیاءؑ
کا خالق مقسم بہ ہے۔ اور دوسرے فریق کے نزدیک نفس اشیاء مذکورہ ہی مقسم
بہ ہیں۔ چونکہ امام موصوف نے ہر دو فریق کے اقوال کے نقل کر دینے ہی پہ اکتفا
کیا ہے۔ اور اپنی کوئی رائے نہیں لکھی ہے اس لئے ہم اس بحث کی تفصیل پیش
کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔

حضرت امام رازیؒ نے اس سلسلہ میں ایک اور نہایت اہم بحث کی ہے
جس کا ایک طالب قرآن کے سامنے ہونا نہایت ضروری ہے اور وہ اس
موقع پہ قسم کھانے کی ضرورت یا عدم ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اس بحث کا
خلاصہ یہ ہے کہ یہاں دو طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ قسم کا مقصود یا تو مومن سے کوئی بات منوانا ہو سکتا ہے یا کافر
سے۔ پہلی صورت تو باطل ہے اس لئے کہ مومن تو بغیر قسم ہی کے تسلیم کئے ہوئے
ہے۔ اور دوسری صورت بھی باطل ہے اس لئے کہ منکر آپ کی بات قسم
کھانے سے نہ تسلیم کرے گا بلکہ اسے دلیل ہی سے قائل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اس سورہ کے شروع میں وحدانیت پر قسم کھائی ہے اور سورۂ ذاریات کے اوائل میں وقوع قیامت کے ثبوت میں قسم کھائی ہے۔ ان مطالب عالیہ کو (ملاحدہ و دہریہ کے اوہام باطلہ کی تردید کے ساتھ) قسم کے ذریعہ سے ثابت کرنا عقلاء کے طریقہ کے منافی ہے۔

ان شبہات کے تین جواب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) خداوند تعالیٰ نے وحدانیت اور بعث و قیامت کو زیادہ تر ابتدائی سورتوں میں یقینی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ پھر جب دلائل قطعیہ پوری طرح بیان کر دیئے گئے تو دلائل ماسبق کی تاکید کے لئے قسم کھائی گئی۔ خصوصاً قرآن تو عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اور قسم کے ذریعہ سے کلام میں زور پیدا کرنا ان کے ہاں کا عام طریقہ تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب خداوند تعالیٰ نے ان چیزوں سے وحدانیت کے ثبوت پر قسم کھائی تو اس سے متصل ہی ان براہین قاطعہ کا بھی ذکر کیا جو وحدانیت کے باب میں نہایت روشن دلائل ہیں یعنی فرمایا۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ یہ قول اس بنا پر دلیل ہے کہ خداوند تعالےٰ نے اپنے اس قول میں (لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا) بیان فرما دیا ہے کہ آسمان و زمین کا نظام وحدانیت پر شاہد ہے۔ بعینہٖ یہاں بھی جب یہ کہا گیا کہ (اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ) تو اس کے متصل ہی بطور دلیل کے یہ بیان کیا

گیا۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ)
گویا یوں کہا گیا کہ آسمان وزمین کے نظام میں تفکر و توحید باری پر شاہد ہے پس
اے لوگو اس دلیل میں غور کرو تا کہ تمہیں توحید کا اذعان حاصل ہو۔
(۳) یہ کلام بت پرستوں کے اعتقاد کثرت آلہہ کے ابطال میں واقع ہے۔
گویا یوں کہا گیا کہ بت پرستوں کا مسلک اتنا بودا ہے کہ اس کے ابطال کے لئے
تاکید کے ساتھ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے ان آیات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے۔
اسے اجمالاً تین سرخیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(۱) مقسم بہ کی تعیین
(۲) مقسم بہ اشیاء مذکورہ ہی ہیں یا اس کے علاوہ کوئی دیگر شے ہے؟
(۳) مقسم بہ کا مقصد اس موقع پر کیا ہے؟

امام موصوف نے مقسم بہ کے بارے میں بہت سی صورتیں بیان فرما دی
ہیں، مگر مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں فرمائی
اس لئے بجز احتمالات کے نقل کرنے کے کوئی قطعی اور محکم رائے بھی ظاہر نہ کی ممکن
ہے ایسا اس لئے کیا ہو کہ اس سے طلبہ قرآن میں محنت و جانفشانی سے صحیح راہ
تلاش کرنے کی قوت پیدا ہو۔ رہی یہ بحث کہ مقسم بہ نفس اشیاء مذکورہ ہیں یا
ان کے علاوہ کوئی دیگر چیز ہے تو ہم نے جہاں تک غور کیا ہے اسی نتیجہ پر

پہنچے ہیں کہ قرآن مجید میں قسم کھانے کی غایت و غرض پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ بحث پیدا ہو گئی سورتیں بہ منصۂ شہود پہ نہ آتی۔ اسی وجہ سے یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اس موقع پر قسم کھانا مناسب تھا یا نہیں یا یہ کہ یہاں پر قسم کھانے میں کیا مصالح ہیں؟ امام موصوف نے پہلے تو اس موقع پر قسم کھاتے ہیں چند در چند زحمتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس کے بعد ان زحمتوں کے مختلف حل بتائے ہیں لیکن ایک صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں کہ امام موصوف کے ان جوابات میں بہت ہی تضاد ہے۔ مثلاً پہلے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم دلائل سے مسبوق ہوا کرتی ہے، اور اصل اعتبار دلائل کا ہے، اور قسم تو محض عربوں کے عام طریقہ کے مطابق محض تاکید کے لئے لائی جاتی ہے۔ غور کیجئے ترتیب قرآن سے یہ جواب کتنا البعد ہے اس لئے کہ قسمیں تو زیادہ تر ان سورتوں میں آئی ہیں جو پہلے نازل ہوئی۔ اور دلائل بعد کی سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ امام موصوف کے دوسرے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ قسم کے بعد اس موقع پر ایک ایسا قول مذکور ہے جس میں حجت و برہان کا بہت ہی زبردست پہلو ہے، اور قسم محض تنبیہ کے لئے ہے دیکھئے اس جواب میں اور ماقبل والے میں کیا سر مو بھی فرق ہے؟ اور دونوں میں سے کیا ایک بھی اصل مسئلہ سے متعلق کچھ کہا گیا ہے؟ تیسرا جواب تو بہت ہی گرا ہوا ہے۔ وہ اس لئے کہ پہلے دونوں جوابوں میں تو امام موصوف نے یہ دعویٰ کیا کہ قسم میں شہادت کا کوئی پہلو نہیں اور تیسرے جواب میں اس کا حجت ہونا خود ہی تسلیم

کر دیا ہے گو کہ ملکے درجہ کی حجت[1] و دلیل۔

ذیل کی سطروں میں اب ہم مقسم بہ کی تعیین قسم کی اس موقع پر ضرورت اور مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کی بابت اپنی رائے پیش کریں گے لیکن مناسب ہوگا کہ قبل اس کے کہ ان مباحث کی تحقیق میں پڑیں۔ ایک نہایت ضروری مرحلہ سے گذر لیا جائے اور وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے عمود کی تعیین ہے۔

سورہ کا مرکز پیش نظر سورہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ توحید اور قیامت کے ثبوت میں واقع ہے یعنی ایک طرف تو اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک خدا کی بے پایاں قدرت کا مظہر ہے۔ کوئی چیز اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک کی ضروریات کا مرکز وہی ہے۔ اس کے علاوہ تمام کے تمام رشتے بے معنی ہیں مخلوقات کی احتیاج بالخصوص حضرت انسان کی ضروریات یہیں پر ختم نہیں ہوتیں بلکہ کل کی زندگی میں جب خدا کی عدالت عالیہ قائم ہوگی تو وہ رحمت خداوندی کا اور زیادہ محتاج ہوگا۔ الغرض اگر یہ سورہ غور سے پڑھی جائے تو ہر شخص کو ادنیٰ تامل نظر آسکتا ہے کہ پوری سورہ میں یہی دونوں حقیقتیں پھیلی ہوئی ہیں۔

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد اب ہم مقسم بہ کی شرح و تعیین کریں گے۔

مقسم بہ کی شرح و تعیین | وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِيٰتِ

[1] ماخوذ از امعان فی اقسام القرآن مصنفہ صاحب نظام القرآن صفحہ ۵-۴

ذوکدا گ، تفسیروں کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین میں سے بیشتر لوگوں کا ان اوصاف کے بارے میں یہی خیال ہے کہ ان کا موصوف گھوڑا ملائکہ ہے ہمارے نزدیک بھی یہی صورت انسب ہے اس کے علاوہ جتنی صورتیں مذکور ہیں ان میں سے کوئی بھی چسپاں نہیں ہوتی۔ وجوہ ترجیح مناسبت کی بحث سے سمجھ میں آجائیں گے۔

قسم کی غرض | اوپر کی سطروں سے مقسم بہ کی تعیین ہو گئی۔ رہا یہ سوال کہ اس موقع پر قسم کیوں لائی گئی؟ اس کا وہ جواب انسب نہیں جو حضرت امام رازی علیہ الرحمۃ نے اختیار کیا ہے بلکہ اس باب میں صاحب نظام القرآن نے قسم کا جو مفہوم بیان کیا ہے اگر اسے سامنے رکھا جائے تو وہ تمام کی تمام دقتیں جو امام موصوف کے جواب سے پیدا ہو جاتی ہیں یک قلم دور ہو جائیں گی یعنی یہ کہ قسم کا اصل مقصود استشہاد ہے تعظیم و احترام کا پہلو نہیں ہے مواقع پر ہوگا جہاں خداوند تعالیٰ کی ذات بابرکت یا اس کے شعائر کی قسم کھائی گئی ہو۔ اور اس صورت میں بھی تعظیمی پہلو ضمنی ہوگا۔ اصل مقصد استشہاد و استدلال ہی ہوگا۔ کلام عرب سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے تفصیل کے لئے امعان فی اقسام القرآن کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

سطور بالا سے مقسم بہ کی تعیین اور قسم کی حقیقت اجمالاً سمجھ میں آگئی ہوگی اب ہم مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت دریافت کریں گے۔

مقسم بہ او مقسم علیہ میں مناسبت | یہ بیان ہو چکا ہے کہ پیش نظر سورہ توحید و قیامت کے ثبوت میں واقع ہے یعنی یہ کہ اس عالم میں جتنے بھی انقلابات و تغیرات ہوتے ہیں۔

سب کا مرکز محض ایک ذات ہے وہی سب کچھ کرتی ہے اس کے ایما کے بغیر
کوئی تبدیلی بھی ظہور میں نہیں آسکتی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے ایسی
ذات جس کی قدرت و تصرف کے بے شمار مظاہر ہیں۔ ضرور بالضرور اس نے اس عالم
کی پیدائش کی کوئی اہم غایت رکھی ہوگی۔ اسی کو قرآن قیامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اب
اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کے دعوے اور دلیل میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں؟۔

قرآن مجید کے طالب علم سے یہ مخفی نہیں کہ قرآن پاک میں بے شمار ایسی آیات
ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ منجملہ جنود الٰہی ہیں۔ ذیل کی آیتوں پر غور کیجئے۔

سورۂ انفال میں ہے:۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ
فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ
مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝ وَمَا
جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ
بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ
عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝
إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ
وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً
لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ

یاد کرو اس وقت کو جب تم اپنے پروردگار
سے فریاد کرتے تھے پس اس نے تمہاری فریاد سن
لی کہ میں لگاتار ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا
اور خدا نے فرشتوں کی مدد تمہیں خوش کرنے کے لیے
کی ورنہ فتح تو خدا ہی کے ہاتھ میں ہے بیشک خدا
غالب اور حکمت والا ہے، یاد کرو اس وقت
کو جب کہ خدا تمہاری تسکین کے لئے نیند تم پر طاری
کرتا تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا
کہ اس سے تم کو پاک کرے۔ اور شیطانی گندگی

رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ط سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝

(رکوع اول)

تم سے دور کردے اور تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھائے اور اس کے ذریعہ سے تمہارے قدم جمائے رکھے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ تمہارا پروردگار فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس تم مسلمانوں کے قدم جمائے رکھو عنقریب کافروں کے دل میں رعب ڈالینگے پس مارو گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر۔

ایک دوسری جگہ ہے:-

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (توبہ-۴)

پھر خدا نے اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل فرمائی اور غیر مرئی فوجیں بھیجیں - اور کافروں کو سخت مار ماری اور کافروں کو یہی جزا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر ہے:-

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اگر تم اس کی مدد نہ کرو (تو کچھ پروا نہیں) اس لیے کہ اس نے اس وقت اپنے رسول کی مدد کی

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَاَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی وَکَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (توبہ-۶)

تھی جب کافروں نے گھر سے باہر نکال دیا دونوں کو۔ وہ اس وقت یہ دونوں غار میں تھے، یاد کرو اس وقت کو جبکہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا غم نہ کرو بیشک خدا ہمارے ساتھ ہے پس خدا نے اپنی تسلی اس پر نازل فرمائی اور غیر مرئی افواج سے اس کی مدد کی اور کافروں کی بات کو نیچی کر دیا۔ اور خدا ہی کا بول بالا ہے اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر ہے :۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُنْزَلِیْنَ ۝ بَلٰٓی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۝

(آل عمران-۱۳)

یاد کرو جب کہ تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے۔ کہ کیا تمہارے لئے یہ بس نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے ضرور، بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن اسی دم تم پر چڑھ دوڑیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

سورہ ذاریات میں ہے :-

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا	کہا تمہاری کیا مہم ہے اے فرستادگان...
الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْا اِنَّا اُرْسِلْنَا	وہ بولے ہم ایک گنہگار قوم کی طرف بھیجے
اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ	گئے ہیں تاکہ ان پر پتھراؤ کریں جو مسرفین
حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً	کے لئے خدا کے یہاں نامزد ہے ....

عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ (رکوع ۲)

مذکورہ بالا آیات میں تصریح ہے کہ خدا کی غیر مرئی فوجوں میں سے ملائکہ بھی ہیں اور اس غیر مرئی فوج سے بارہا اس نے حق پرستوں کی تائید کی ہے، اور پرستاران باطل کو پسپا کیا ہے۔ ایسا تقریباً ہر پیغمبر کے عہد میں ہوا ہے قرآنی تصریح کے بعد مزید دلائل کی ضرورت نہیں۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مناسبت کے سلسلہ میں جو کچھ تم نے کہا ہے اس سے اصل سوال تو حل نہ ہوا، واقعتاً ایسا ہی ہے۔ لیکن جب مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں غور کیا جائے گا تو ہر شخص یہ تسلیم کرے گا کہ دنیا میں رحمت اور نقمت کے بے شمار مظاہر فرشتوں کے ہاتھوں ظہور میں آتے ہیں۔ فرشتے ہی تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس پیام بشارت لائے تھے! اور یہی فرشتے قوم لوط کے لئے صاعقۂ ہلاکت ثابت ہوئے! اور یہی فرشتے تھے جو قرن اول میں حزب اللہ کے پہلو بہ پہلو حزب الشیطان سے برسرپیکار نظر آتے تھے! الغرض ملائکہ کے ہاتھوں دنیا میں جو رحمت و نقمت ظہور

میں آتی ہے۔ اس میں وحدانیت اور عدالتِ کبریٰ کے ثبوت پر کافی شہادت ہے۔ وہ اس طرح کہ ملائکہ کا پرستارانِ حق کے پہلو بہ پہلو احقاقِ حق اور استیصالِ باطل میں جد وجہد کرنا دلیل ہے اس امر پر کہ یہ کسی کے ماتحت ہیں اور یہ ان تمام لوگوں کے دشمن ہیں جو حدود اللہ سے سرکشی کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے دوست ہیں جو خدا کی سرزمین پر رشد وہدایت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ فرشتوں کے کاموں میں جو تضاد پایا جاتا ہے (یعنی مومنین کے ساتھ ان کی شفقت وہمدردی خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے اور کفار کے ساتھ ان کی تندی وسختی[1]) یہ شاہد ہے اس امر پر کہ ہو بہو یہی نقشہ (تفریق بین الصالح والمفسد) قیامت کے دن بھی پیش آئے گا۔

[1] قرآن مجید میں بیشمار ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ متمردین کے حق میں بددعا اور اظہار لعنت کرتے ہیں اور مومنین کیلئے بارگاہِ الٰہی میں رحمت کی دعا کرتے ہیں اور ظن غالب یہ ہے کہ پیش نظر سورہ میں فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (داؤد اکبر اصلاحی)

قٓ وَالقرآنِ المجید

کے متعلق

دو سوال اور اس کا جواب
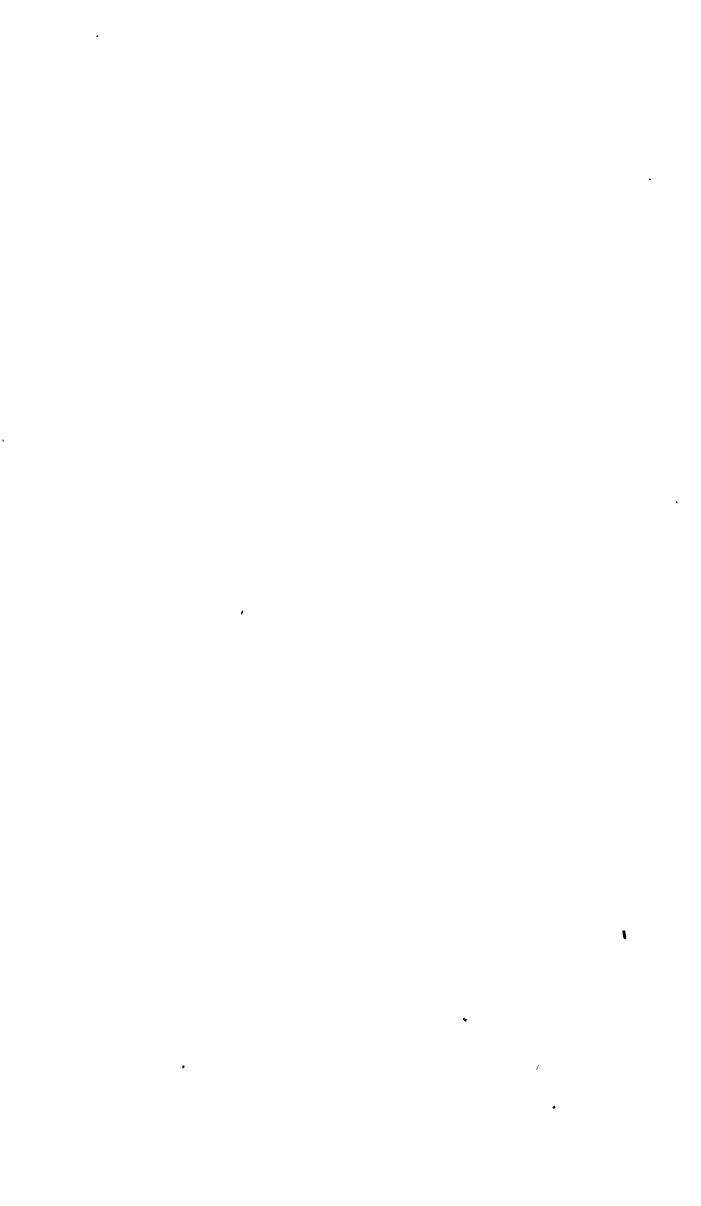
قرآن مجید کے ایک طالب علم لکھتے ہیں:۔

"اس وقت سورہ قٓ زیر مطالعہ ہے، بے شمار مقامات حل طلب ہیں، ارادہ تھا کہ اس سورہ سے متعلق جتنے شکوک وشبہات ہیں سب لکھ بھیجوں لیکن زیادہ بہتر یہ معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ ایک ایک دو دو شبہہ پیش کروں اس لئے آج صرف مذکورہ بالا سورہ کی پہلی آیت کے متعلق دو سوال کرتا ہوں:

(۱) قرآن مجید کے متعلق تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ فصاحت و بلاغت میں دنیا کا کوئی کلام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن ایک طالب علم کو لفظ قٓ اور اس طرح کے دوسرے الفاظ (مثلاً ن، ص، طٰہٰ، الٓمٓ، الرٰ وغیرہا) سے اس کی فصاحت میں شبہ ہو سکتا ہے کہ بظاہر بے معنی الفاظ کیوں لائے گئے ہیں آخر اس کا تشفی بخش جواب کیا ہوگا۔

(۲) قرآن شریف کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے اور اس کا مقسم علیہ کیا ہے"

قرآن مجید میں حروف مقطعات کی بحث نہایت اہم ہے اور ہر دور کے مفسرین نے اسے حل کرنے کی کوشش فرمائی ہے لیکن اس بارے میں کسی ایک خیال پر ان کا اجتماع نہیں ہو سکا ہے بلکہ تقریباً ہر مقام پر جہاں جہاں اس طرح کے حروف آتے ہیں ان کے تحت متضاد اقوال کتب تفسیر میں ملتے ہیں، مثال کے طور پر ن (ن والقلم وما یسطرون) کے تحت مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نٓ سے مراد دوات ہے۔

۲۔ بعض لوگوں کی رائے میں اس سے لوح محفوظ مراد ہے۔

۳۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جنت میں اس نام کی ایک نہر ہے اسی سے وہی مراد ہے۔

۴۔ بعض بزرگوں کے نزدیک اس سے ایک مچھلی مراد ہے جس کی پشت پر زمین[1] قائم ہے وغیرذالک

اسی طرح لفظ قٓ کے بارے میں بھی بہت سے اقوال تفسیر کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

۱۔ بعض لوگوں کے نزدیک قٓ اسماء الٰہی میں سے ہے۔

۲۔ بعض لوگوں کے خیال میں اس سے ایک پہاڑ مراد ہے جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے

---

[1] تفسیر کبیر و درمنثور وغیرہ

۳۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ یہ منجملہ اسماء قرآن ہے۔

۴۔ بعض بزرگوں کے نزدیک اس سے کوہ قاف مراد ہے۔[1]

تفسیر کی کتابوں میں حروف مقطعات میں سے ہر ایک کی بابت بے شمار روایات منقول ہیں معلوم نہیں ان روایات کا سند کے اعتبار سے کیا پایہ ہے۔ مفسرین کے نزدیک تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایتیں بہت زیادہ اہم نہیں ہیں ورنہ وہ انہیں پر اپنی رایوں کی بنیاد رکھتے، درحقیقت حروف مقطعات کا مسئلہ نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے، ان کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے سے قبل ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے اور وہ یہ ہے کہ حروف مقطعات فہم قرآن میں مانع نہیں ہیں۔ اگر ان کے معانی اور حقائق بظاہر ابھی دیر کے لئے ہمارے ذہن میں نہیں آتے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ بے معنی ہیں بلکہ یہ خیال کرنا چاہئے کہ ابھی فہم قرآن کی تمام راہیں ہم پر کھلی نہیں ہیں اور اس کے لئے بڑی کوشش کی ضرورت ہے۔

اگر حروف مقطعات بے معنی ہوتے تو سب سے پہلے عربوں کو اس پہ اعتراض ہوتا لیکن یہ مسلّم ہے کہ اہل عرب نے کبھی بھی حروف مقطعات کے خلاف زبان نہیں کھولی بلکہ منکر سے منکر شخص بھی قرآن کی آیات سن کر سر دھنتا اور اس کی بلاغت اور اعجاز کا اقرار کرتا تھا۔ یہ حروف یوں ہی تبرکاً سورتوں کے شروع میں نہیں

---

[1] تفسیر کبیر و درمنثور

لائے گئے ہیں۔ بلکہ ان کے بطون میں معانی بھی پنہاں ہیں، اس کی اصل یوں ہے کہ سامی زبان جس سے عربی نکلی ہے اس میں یہ بات عام تھی کہ وہ حروف مفردہ کو لمبے چوڑے مضامین کی تعبیر کے لئے استعمال کرتے تھے، اب تو اکتشافات جدیدہ سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچ چکی ہے، مثلاً نؔ کو مچھلی کی شکل سے خاص مشابہت ہے۔ اگر انہیں کوئی مچھلی والا واقعہ بیان کرنا ہوتا تو نؔ لکھ دیتے تھے۔ پہلے عربی زبان میں بھی اس کا رواج تھا۔ خلاصہ یہ کہ حروف جن سورتوں کے شروع میں ہیں ان میں سے ہر ایک کو مضمون سورہ سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن اس کے لئے بہت نظر و فکر کی ضرورت ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن شریف کی قسم یہاں کیوں کھائی گئی ہے اور کس چیز پر کھائی گئی ہے تو اہل علم کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ قسم کھانے کی غرض شہادت ہے یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ شہادت کے ساتھ تعظیم کا پہلو بھی پایا جاتا ہے مثلاً خدا کی قسم ہو یا کعبہ یا کسی اور محترم چیز کی ہو تو وہاں دونوں پہلو ہوں گے۔ لیکن اکثر و بیشتر قرآن مجید میں قسم سے مقصود شہادت ہی ہے تعظیم کا پہلو کم جگہ پایا جاتا ہے لیکن بالعموم قسم کو چونکہ تعظیم ہی کے لئے سمجھا جاتا ہے اس لئے لوگوں نے رائی کو پربت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ کی قسم میں تین اور زیتون کو مقدس ثابت کرنے کے لئے ان کے بہت سے فائدے بیان کئے اور قسم کھانے کی غرض شہادت ٹھہرانے کے بعد اس کی بالکل ضرورت باقی نہیں رہتی۔

رہا یہ سوال کہ سورہ ق کی قسم کا مقسم علیہ کیا ہے اور ان دونوں میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں؟ تو پوری سورہ کو بار بار پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس سورہ میں قرآن مقسم بہ بھی ہے اور مقسم علیہ بھی یعنی دلیل اور دعویٰ دونوں ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن ایک صحیفہ فطرت ہے اس کی تعلیمات فطرت انسانی کے مطابق ہیں اس کی آواز دل کی آواز ہے اس کا نغمہ فطرت کا نغمہ ہے اس لئے اس کے اثبات کے لئے کسی خارجی دلیل کا لانا اس کی حقانیت اور بدیہیت پر پردہ ڈالنا ہے بعض چیزیں ایسی واضح ہوا کرتی ہیں کہ وہ اپنے وجود پہ آپ دلیل ہوتی ہیں ان کو ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی دلیل کی مطلق ضرورت نہیں ہوا کرتی مثلاً آفتاب اپنے وجود پر خود دلیل ہے یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے بعض حضرات نے اس قسم کا مقسم علیہ "أاذا متنا وکنا ترابا ذالك رجع بعید" کو قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ آیت یہاں دعویٰ کی حیثیت سے نہیں آئی ہے۔ بلکہ اس میں معاد کے متعلق کفار کا ایک شبہ نقل کیا گیا ہے ہمارے نزدیک اس کا مقسم علیہ محذوف ہے یعنی "انه (القرآن) لحق" ہے، رہا یہ سوال کہ اثبات قرآن کے بعد معاد کا ذکر کیوں چھیڑ دیا گیا۔ تو اس کا تعلق موضوع سورہ سے ہے اور اس تفصیل میں یہاں پڑنے کا موقع نہیں اسی لئے اسی پر بس کرتے ہیں۔

تنزیل و تاویل

سورۂ طور کی قسمیں

قرآن پاک کا ہر طالب علم جب اس سورہ کو پڑھے گا تو باقول وہلہ اس کے ذہن میں اس کی قسموں کی غرض و غایت کی بابت ضرور سوال پیدا ہوگا۔ ہمیں بھی قرآن مجید کے اسرار و حکم معلوم کرنے کا شوق ہے۔ گو کہ ؎

احب الصالحین ولست منہم
لعل اللہ یرزقنی الصلاحا

اس لئے مطالعہ کے وقت ہمارے ذہن میں بھی اس کی قسموں کی بابت نہایت اہمیت سے سوال پیدا ہوا۔ آج کی صحبت میں اسی سوال کی ہم تحقیق کرینگے لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے اس اہم سوال کا جو حل سوچا ہے۔ اسمیں اندیشہ ہے کہ ارباب تفسیر کو اس باب میں ہمارے بیشتر نظریات سے اختلاف ہوگا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ پھر ایسے غیر معروف نظریئے پیش کرنے کی ضرورت

ہی کیا ہے؛ واقعتاً ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن ہم پوری ایمانداری سے کہتے ہیں کہ اس سوال پہاس اد ملکے ساتھ ہم نے قلم اٹھایا ہی ۔۔۔۔ نہیں ہے کہ اس کی تمام پرپیچ وادیاں ہموار کر لی ہیں۔ بلکہ محض اس توقع پر اس کٹھن راہ میں قدم رکھا ہے کہ ممکن ہے خدا کوئی بہترین حل سجھا دے۔ اس لئے کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا کا اصول اٹل ہے، اور اس امید پر کہ اگر ہمیں اصل حقیقت کے سراغ لگانے میں ناکامی ہوئی تو بہت ممکن ہے وہ حضرات جو فہم قرآن کی دولت سے مالا مال ہیں اس باب میں ہماری رہبری فرماوینگے اس لئے کہ "وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ" اپنی جگہ پر ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں لیت و لعل کی یک قلم گنجائش نہیں ہے۔

مرکز کی تعیین

قبل اس کے کہ پیش نظر سورہ کے منقسم بہ کی غرض و غایت کی بابت کچھ عرض

کریں مناسب ہوگا کہ ایک نہایت ہی اہم اور ضروری مرحلے سے گذر لیا جائے تاکہ اس سے متعلق اور مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کے مرکز کی تعیین ہے۔

سورۂ طور کی شہادتوں کا مرکز

اس میں شک نہیں کہ اس سے ماقبل کی سورہ دینونت (جزا و سزا) کے اثبات میں واقع ہے اور اس کی جملہ قسمیں قیامت کبریٰ کے وقوع پر شاہد عدل ہیں۔ پیش نظر سورہ میں بھی غور و فکر کرنے سے یہی مترشح ہوتا ہے اور یہ کچھ ہمارا ہی نظریہ نہیں ہے بلکہ جمہور مفسرین بھی اس بارے میں ہمارے ہمنوا ہیں۔ فرق محض اجمال و تفصیل کا ہے۔

مقسم علیہ کی تعیین کے بعد قاعدہ کی رو سے ہمیں مقسم بہ اور مقسم علیہ کی مناسبت سے بحث کرنی چاہیئے لیکن بغیر قسموں کی شرح و تعیین کے مناسبت کی بحث قبل از وقت ہوگی۔ اس لئے پہلے ہم قسموں کی شرح و تعیین کرینگے۔

سورۂ طور کی قسموں کی شرح و تعیین

وَالطُّوْرِ۔ وقوع دینونت پر یہ پہلی شہادت ہے۔ تفسیروں کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف سے لے کر آج تک تمام مفسرین اس شہادت کے بارے میں متفق ہیں کہ اس سے وہی جبلِ اقدس مراد ہے جس پر حضرتِ موسےٰ علیہ السلام کو شرف تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی لئے اس پر ا۔ ل تعریف کا بھی داخل ہے۔ اور دوسرے مواقع پہ اضافت کے ساتھ مذکور ہے (وطور سینین وطور سیناء)

وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ۔ عدالتِ الٰہیہ کے قیام کے باب میں یہ دوسری شہادت ہے۔ اس شہادت کے بارے میں تفسیروں میں متعدد اقوال مذکور ہیں۔ ان میں سے چند مشہور اقوال کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے تفصیل کے لئے ابن جریرؒ اور دیگر تفاسیر کی جانب مراجعت کرنی چاہئیے۔

۱) بعض حضرات اس سے لوحِ محفوظ مراد لیتے ہیں۔

۲۔ بعضوں کے نزدیک اس سے اعمالنامہ مراد ہے۔

۳۔ بعضے اس سے معلق صحیفہ مراد لیتے ہیں۔

۴۔ بعض بزرگوں نے اس سے قرآنِ پاک مراد لیا ہے۔

۵۔ کچھ لوگوں نے اس سے توراۃ مراد لی ہے۔

اس شہادت کے بارے میں مشہور اقوال یہی ہیں۔ ہمارے نزدیک دو ابتدائی قولوں کے علاوہ بقیہ کے لینے میں کچھ حرج نہیں تفصیل مناسبت کے باب میں آئے گی۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ۔ عدلِ الٰہی کے ثبوت میں یہ تیسری حجت ہے۔ اس کے بارے میں دو قول مشہور ہیں۔

۱۔ بعض حضرات اس سے خانہ کعبہ مراد لیتے ہیں۔

۲۔ بعض بزرگوار اس سے خانہ کعبہ کے محاذ ہی میں ملائکہ کا کعبہ مانتے ہیں۔

مذکورہ بالا شہادت کے بارے میں مفسرینؒ سے بھی دو ما قوال پایۂ شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ ہمیں ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کے وجوہ مناسبت کے باب میں مذکور ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۔ وقوع جزا پر یہ چوتھی دلیل ہے اس شہادت کے بارے میں جمہور مفسرین متفق ہیں کہ اس سے نظام علوی مراد ہے۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۔ یہ وقوع قیامت پر پانچویں حجت ہے۔ اس کے متعلق تفسیروں میں دو اقوال مذکور ہیں جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ دنیا کے عام موجزن دریا مراد ہیں۔

۲۔ وہ عظیم الشان دریا مراد ہے جو عرش کے نیچے اور آسمان کے اوپر واقع ہے۔

اس بارے میں مفسرینؒ سے بھی دو اقوال منقول ہیں۔ پہلے قول سے تو ایک حد تک ہمیں بھی اتفاق ہے، لیکن دوسرے قول کی کوئی توجیہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس روایت سے یہ قول ماخوذ ہے وہ ناقابل قبول ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہنے کی جرأت کرینگے کہ اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں لانا غیر ضروری ہے۔ ہم نے سیاق و سباق کی روشنی میں اس شہادت سے متعلق ایک دوسری رائے قائم کی ہے۔ وہ یہ کہ اس سے وہ

دریا مراد ہے جس میں فرعون کی قوم غرق کر دی گئی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل مناسبت کے باب میں بیان ہو گی۔

تفصیل بالا سے مقسم بہٖ کی تعیین ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان شہادتوں میں مناسبت ہے یا نہیں؛ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ دعویٰ اور دلائل میں کوئی لگاؤ ہے یا نہیں؟

مقسم بہٖ اور مقسم علیہ میں مناسبت

اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ پیش نظر سورہ کی پانچوں شہادتوں کا مرکز ایک ہے یعنی یہ کہ دینونیت کبریٰ کا وقوع یقینی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اتقیاء و اشقیاء میں تفریق کی گھڑی ضرور آئے گی۔ اس کے بغیر نظامِ عالم عبث ہے اب ہم تمام شہادتوں کی دعوے سے مناسبت بیان کریں گے تاکہ مقسم بہٖ اور مقسم علیہ میں جو حقائق پوشیدہ ہیں اجاگر ہوں۔

۱۔ وَالطُّوْرِ۔ یہ کسی پر مخفی نہیں کہ طور ہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے ایک مقہور اور مظلوم قوم کو اس کے صبر و برداشت کی بدولت اپنی نوازشہائے بے پایاں سے نوازا اور اس کے دشمنوں کی دھاک مٹا دی اور اسے ایک ایسی شریعت بخشی جو منکرین و معاندین کے لئے یکسر تازیانۂ عذاب تھی اور طالبانِ حق کے لئے سراپا رحمت و اکسیر۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے اس روحانی عطیۂ خداوندی کو قبول کیا، خدا نے سارے عالم کے قلوب ان کی طرف جھکا

دیئے اور سارے عالم کی گلہ بانی ان کے سپرد کر دی، اور جن لوگوں نے اس کے قبول کرنے سے اعراض کیا وہ دنیا اور آخرت کی دونوں دولتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ خسر الدنیا والاخرۃ۔ یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے بنی اسرائیل کی تاریخ ہمارے دعوے پر شاہد ہے الغرض اس مقام پر جو واقعہ ہوا وہ مظلوم حامیان حق پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی ایک نہایت روشن مثال ہے۔ اس لئے کہ عدالت الٰہیہ کے قیام کے وقت بھی ایسا ہی ہوگا کہ جو مقہور ہیں وہ غالب ہونگے، جو بھوکے ہیں وہ آسودہ ہونگے، اور جو ظالم ہیں وہ ذلیل و شرمسار ہوں گے، اور جو سرکش ہیں آسمانی بادشاہت کا دروازہ ان کے لئے کبھی نہ کھلے گا۔

۲۔ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ۔ اس شہادت میں دنیونت کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر اس سے عام صحف سماویہ مراد لئے جائیں تو اس میں بھی کوئی زحمت نہیں۔ دنیا میں جتنے انقلابات ہوتے ہیں ان میں سب سے اہم کڑی صحف سماویہ کا نزول ہے، اس لئے کہ اس سے محض قوموں کے ظاہری احوال ہی میں تغیر نہیں ہوا ہے بلکہ ان کی روحانی زندگی کی بھی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ ایسا تمام پیغمبروں کے عہد مبارک میں ہوا ہے۔ سو جس طرح ہر بعثت کے وقت مجموعہ اضی پر انقلاب ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر صحیفہ آسمانی ہی کا دخل تھا، اسی طرح جب وہ فیصلے کی گھڑی آ پہنچے گی تو ایک انقلاب عظیم ظہور میں آ جائے گا۔ کتنے اگلے

پیچھے کی صف میں ہونگے، اور کتنے ضعیف و ناتواں عرشِ الٰہی سے قریب ہونگے
الغرض صحائف کے نزول میں بھی دینونت کی روشن مثال ہے، اور یہی دینونت
کا نقشہ قیامت کے دن نظروں کے سامنے ہوگا۔

اور اگر اس شہادت سے توراۃ مراد لیں۔ جیسا کہ پہلی شہادت (جبالطور)
کا اقتضا ہے۔ تو اس صورت میں بھی دینونت کا پہلو واضح ہے۔ وہ یوں کہ جس
طرح توراۃ کے نزول سے عناصر فاسدہ کا قلع قمع کر دیا گیا اور مغروروں کو سرنگوں
کیا گیا۔ (بنی اسرائیل کی تاریخ اس نظریہ کی تصدیق کرے گی) بعینہٖ اسی طرح
اُس روز جب کہ خدا کی عدالت قائم ہو گی، مجرمین اپنے اعمال کی سزا پائینگے
اور صلحاء نعمائے الٰہی سے لطف اندوز ہونگے۔ نزول توراۃ کے بعد جو کچھ ہوا اس
میں دینونت کی روشن مثال ہے۔

اور اگر اس شہادت سے قرآنِ پاک مراد لیا جائے، جیسا کہ اکثر مفسرینؒ
کا خیال ہے اور اسی نظریہ کی پُرزور تائید امام ابن قیمؒ نے بھی اپنی معرکۃ الآراء
تصنیف اقسام القرآن میں کی ہے، تو بھی کوئی دقت نہیں، اس لئے کہ قرآن
پاک کا دینونت ہونا صحف سابقہ سے بھی ثابت ہے۔

حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں:۔

جس پتھر کو راہگیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا یہ خداوند کی طرف سے
ہے اور ہماری نظروں میں عجیب، اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت

تم سے لے لی جائے گی۔ اور اس قوم کو جو اس کے پھل لاتے گی دے دی جائیگی۔ جو اس پتھر پر گریگا چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گریگا اسے پیس ڈالے گا۔

(متی باب ۲۱۔ آیت ۴۳۔۴۴)

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"اس وقت آسمان کی بادشاہت اس دس کنواریوں کی مانند ہوگی جو اپنی مشعلیں لے کر دولہا کے استقبال کے واسطے نکلیں۔ ان میں پانچ ہوشیار اور پانچ نادان تھیں۔ انہوں نے اپنی مشعلیں لیں مگر تیل ساتھ نہ لیا۔ پر ہوشیاروں نے اپنی مشعلوں کے ساتھ برتنوں میں تیل لیا۔ جب دولہا نے دیر کی سب اونگھنے لگیں اور سو گئیں آدھی رات کو دھوم مچی کہ دیکھو دولہا آتا ہے اس کے استقبال کے واسطے نکلو تب ان کنواریوں نے اٹھ کر اپنی مشعلیں درست کیں۔ اور نادانوں نے ہوشیاروں سے کہا اپنے تیل میں سے ہمیں بھی دو کہ . . .

. . . .

ہماری مشعلیں بجھی جاتی ہیں پر ہوشیاروں نے جواب میں کہا ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور تمہارے واسطے کفایت نہ کرے بہتر ہے کہ بیچنے والوں کے پاس جاؤ۔ اور اپنے واسطے مول لو جب وہ خریدنے گئیں دولہا آپہنچا اور وہ جو تیار تھیں اس کے ساتھ شادی کے گھر میں گئیں اور دروازہ بند ہوئے پیچھے وہ دوسری کنواریاں بھی آئیں اور کہنے لگیں اے خداوند اے خداوند ہمارے لئے

دروازہ کھول تب اس نے جواب میں کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ اس لئے جاگتے رہو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کون سے دن یا کون سی گھڑی ابنِ آدم آئے گا۔ (متی باب ۲۵۔ آیت ۱۳)

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"اور درختوں کی جڑ پر اب کلہاڑا رکھا ہے پس ہر ایک درخت جو اچھا پھل نہیں لاتا کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ میں تو تمہیں توبہ کے لئے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن وہ جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے زور آور ہے کہ میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں وہ تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دیگا۔ اس کا سوپ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کریگا اور اپنے گیہوں کو کھتے میں جمع کرے گا پر بھوسے کو اس آگ میں جو ہرگز نہیں بجھتی جلائے گا۔ (متی باب ۳۔ آیت ۱۰۔ ۱۲)

ایک دوسرے موقع پر قرآنِ پاک کو "آتشیں شریعت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا حوالجات سے قرآنِ پاک کا ونبوت کبریٰ کا مظہر ہونا واضح ہے۔ خود قرآنِ پاک میں بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی یہ آخری شریعت منکرین و مکذبین کے لئے تازیانۂ عذاب ہے اور مومنین و موقنین کے لئے سراپا رحمت ہے۔

سورۂ حاقہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ وَاِنَّا	قرآن پاک پرہیزگاروں کے لئے نصیحت
لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ	ہے اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ تم میں سے
وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِيْنَ۔	بعض اس کو جھٹلانے والے ہیں اور اس
(الحاقہ-۲)	میں شک نہیں کہ کافروں پر افسوس ہے۔

ایک دوسرے موقع پر یوں مذکور ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰى	ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو ہے جس نے
عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ	اپنے بندے پر قرآن اتارا اور اس میں
لَّهٗ عِوَجًا۔ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا	کجی نہ رکھی۔ بالکل سیدھی بات ہے
شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ	تاکہ خدا کی طرف سے عذاب شدید سے
الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ	ڈرائے اور جو ایمان والے ہیں (اور) نیک
الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا	عمل بھی کرتے ہیں ان کو اس بات کی خوشخبری
حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا وَّ	دے کہ ان کے لئے عمدہ اجر ہے جس میں
يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ	ہمیشہ وہ رہیں گے، اور ان لوگوں کو عذاب
وَلَدًا۔	سے ڈرائے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا
(الکہف-۱)	ہے۔

مذکورۂ بالا آیات سے واضح ہے کہ ایمان والوں کے لئے قرآنِ مجید

آبِ زلال ہے۔ اور منکرین کے لئے زہر ہلاہل۔ قرآن کی یہ محض دھمکی ہی نہ تھی کہ "اس کا مخالف پسپا اور تباہ ہوگا" بلکہ فی الواقعہ ایسا ہوا بھی اسلام کی تاریخ اس کی تائید کرے گی تفصیل کی اس موقع پر گنجائش نہیں۔

(۳-۴) وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ٭ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ۔ ان دونوں استشہادوں میں سے پہلی شہادت سے معمورۂ ارضی اور دوسری سے یہ سقف نیلگوں مراد ہے! ان دونوں قسموں میں پہلی شہادت سے جمہور مفسرین کے خلاف ہم نے ایک دوسری راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ جزا و دینونت کے باب میں عالم علوی و سفلی سے استشہاد قرآن پاک میں بیک وقت شائع و ذائع ہے اور یہی چیز یہاں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ	رات اور دن کی گردش میں ان عقل والوں
لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ	کے لئے جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے یاد کرتے
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا	ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ	غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ہمارے پروردگار۔ یہ نظام تو نے عبث نہیں بنایا
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا	ہے۔ تو پاک ہے پس ہمیں عذاب دوزخ
سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ	سے بچا۔

(آل عمران)

ایک دوسرے مقام پر ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔

(الحجر-۶)

اور ہم نے نہیں پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور قیامت ضرور آئیگی پس اسے پیغمبر کفار کی شرارتوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ درگذر کرو۔

ایک دوسرے موقع پر یوں مذکور ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (الانبیاء-۲)

اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر۔

ایک اور موقع پر ہے :-

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى الآیہ (الروم-۱)

کیا انہوں نے اپنے جی میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک مدت معینہ تک کے لئے۔

ایک اور مقام پر یوں وارد ہے :-

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ

خدا ہی نے آسمانوں کو بغیر کسی سہارے کے بلند کیا ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو پھر عرش

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا۔ الآیۃ (الرعد-۱)

پر استوار ہوگیا۔ اور اسی نے چاند اور سورج کو مسخر کیا ہے ہر ایک وقت مقررہ تک چلتا ہے وہی امور کی تدبیر کرتا ہے تاکہ تمہارے اندر خدا سے ملنے کا یقین پیدا ہو اور اسی نے زمین کو پھیلایا اور اس میں اٹل پہاڑ اور دریا بنا دیئے۔

ایک دوسری جگہ یوں ہے:-

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (الجاثیہ-۱)

بیشک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے دلائل ہیں۔

ایک اور جگہ یوں مذکور ہے:-

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (النبأ-۱)

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا اور ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو موجب راحت بنایا ہے اور ہم ہی نے رات کو پردہ اور دن کو روزی کے حصول کا ذریعہ بنایا ہے اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے ہیں اور ہم ہی نے روشن مشعل بنائی ہے

احتواء مقصود نہیں ورنہ نہ معلوم کتنے مقامات پر اس قسم کی آیات مذکور ہیں جن میں کہیں تو بلحاظ حکمت ان دونوں چیزوں کو جزاء کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے اور بعض جگہ امکان معاد پر خالق کی قدرت قاہرہ کے ان دونوں مظاہر سے استشہاد کیا گیا ہے۔ یہی چیز ان دونوں پیش نظر آیتوں میں بھی مرعی ہے۔ فرق محض اسلوب کلام کا ہے، ورنہ باعتبار معنی کوئی فرق نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔)

۵۔ والبحر المسجور۔ اس شہادت سے اگر عام موجزن دریا مراد لیا جائے تو اس کی گنجائش ہے اور اس صورت میں مقسم اور مقسم علیہ میں مناسبت کی یہ صورت ہوگی۔ کہ دریاؤں سے جو تباہیاں یا فائدہ رسانیاں ظہور میں آتی ہیں ان میں قیامت کبریٰ کے وقوع کی ایک بہت ہی زبردست مثال ہے لیکن ہمارے نزدیک اس سے بحر قلزم مراد لینا بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ دریا ہے جہاں حق و باطل میں معرکہ آرائی ہوئی۔ پھر آخر کار حق ہی کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور باطل کے علم لے پیچھے گو کہ فوج گراں تھی۔ مگر کچھ نہ کر سکی اور ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے عہد سعید میں ایسا ہوا یا نہیں؟

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ آخر تم سب سے الگ ایک نئی تاویل کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب ہماری طرف سے یہ ہوگا کہ اس کی ہمارے پاس دو وجہیں ہیں۔

۱- اس صورت میں ایک خاص واقعہ ہلاکت کی جانب اشارہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب کو اس واقعہ فاجعہ کا تصور لرزا دے گا اور اس کے دل میں متکبرین کی راہ سے نفرت اور صلحاء کے حصول سے شیفتگی پیدا ہو گی۔ تعمیم کی صورت میں یہ فوائد حاصل نہ ہونگے۔

۲- پہلی قسم کا بھی یہی اقتضاء ہے کہ اس سے بحرِ قلزم ہی مراد لیا جائے۔

والنجم اذا ہوی

اس سلسلہ میں ہم تفصیلاً والنجم کی قسم پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔
اس کے متعلق سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "والنجم" سے کیا مراد ہے
اس سوال کے جو جواب ہمارے مفسرین کرام دیتے ہیں، پہلے ہم مختصراً ان کو
بیان کریں گے۔

مفسرین کے جوابات مختلف ہیں۔

۱۔ بعض لوگ کہتے ہیں نجم سے مراد ثریا ہے۔

۲۔ بعضوں کے نزدیک اس سے عام ستارے مراد ہیں۔

۳۔ بعضوں کے نزدیک اس سے ٹوٹنے والے ستارے مراد ہیں۔

۴۔ بعض حضرات اس سے نجوم قرآن مراد لیتے ہیں۔

۵۔ بعض اس سے نباتات مراد لیتے ہیں۔

ان میں سے پہلا اور دوسرا قول زیادہ مشہور ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ لغت اور کلام عرب کے استعمالات سے انہی دونوں کی تائید ہوتی ہے۔ بقیہ اقوال یا تو بالکل غیر مستند ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض غریب شواہد سے ان میں سے بعض کی تائید ہو سکتی ہے۔ اور تاویلِ قرآن میں غریب اقوال و شواہد سے استناد اہل علم کے نزدیک جائز نہیں۔

پس مقابلۂ ترجیح صرف پہلے دو قولوں میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک مرجح قول دوسرا ہے اور اس کے وجوہ ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ تیسرا قول دوسرے قول کے عموم میں داخل ہے۔

(۱) جہاں تک استعمال کا تعلق ہے۔ والنجم جنس نجوم کے لئے عام طور پر مستعمل ہے۔

علامہ ابن جریر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

وکان بعض اهل المعرفة	بصرہ کے بعض ماہرین لغت
بکلام العرب من اهل	عرب کہتے تھے کہ والنجم سے عام
البصرة یقول عنی بقوله	ستارے مراد ہیں۔ لفظ واحد ہے
"والنجم" والنجوم وقال	مگر معنی میں جمع کے ہے۔
ذهب الی لفظ الواحد وهو	
فی معنی الجمع	

علامہ ابن جریرؒ نے اس قول کی تائید میں یہ شعر بھی پیش کیا ہے۔

فباتت تعد النجم فی مستحیرۃ　　سریع بایدی الآکلین جمودھا

ایک دوسرا شعر ہے:-

فباتت یبوبیہ عرسہ و بناتہ　　و بتّ اریھا النجم این مخافقہ

ہم کلام عرب سے اس قول کی تائید میں اور شعر بھی پیش کر سکتے ہیں مگر چونکہ یہ امر مختلف فیہ نہیں ہے اس لئے زیادہ طوالت کی ضرورت نہیں۔

(۲) قرآن مجید میں "والنجم" عام ستاروں ہی کے لئے آیا ہے مثلاً

(وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۔ (۱۶ : نحل)　　اور بہت سی علامتیں اور ستاروں سے بھی وہ رستہ معلوم کرتے ہیں۔

یہاں قطعی ہے کہ والنجم سے عام ستارے ہی مراد ہو سکتے ہیں، صرف ثریا کو نہیں مراد لے سکتے۔ کیونکہ "اھتداء" رستہ معلوم کرنا صرف ثریا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ خلق کو یہ فیض بہت سے ستاروں سے حاصل ہوتا ہے۔ عرب شعراء نے بہت سے شعروں میں "ثریا" کا ذکر کیا ہے اور اس کے خواص و آثار کی طرف بھی اشارہ کئے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے کسی شعر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ "اھتداء" اس کی مخصوصات میں سے ہے۔ امراء القیس کا ایک شعر ہے۔

ودویۃ لا یہتدی لفلاتھا　　بعرفان اعلام و لا ضوء کوکب

اس میں وہ "اھتداء" کو بے تکلف عام کواکب و نجوم کا فیض قرار دیتا ہے اور امراء القیس کا کیا ذکر خود قرآن میں ہے۔ وھوالذی جعل لکم النجوم

لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ -

سورہ طارق کی آیت بھی ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے ۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ، النَّجْمُ الثَّاقِبُ — اور تو کیا جانے کہ شب آہنگ کیا ہے ؛ دمکتا ستارہ ۔

ان شواہد سے یہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن مجید میں والنجم کا لفظ جنس نجوم کے لئے متعدد مقامات میں آیا ہے اور ایسے واضح قرائن کے ساتھ کہ کسی کے لئے گنجائش اختلاف نہیں ۔ برعکس اس کے ایک شہادت بھی ایسی موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قرآن مجید میں النجم خاص ثریّا کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ پھر ایسی حالت میں والنجم کی قسم میں ثریا مراد لینے سے زیادہ اقرب واضح اور مدلل بات یہ ہے کہ ہم اس سے جنس نجوم کو مراد لیں، جیسا کہ سلف میں سے بعض اہل عربیت کا یہ مذہب ہے ۔

یہاں تک ہم نے لفظ پر لغت اور استعمالات کی روشنی میں بحث کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایک لفظ جس کا اطلاق مختلف معانی پر ہو سکتا ہو ۔ کلام میں اس کے صحیح معنی کی تعیین کا فیصلہ سیاق و سباق اور محل و مقام کے مقتضیات اور مناسبات پر منحصر ہے ۔ اور یہاں تو قسم و مقسم علیہ کی صورت ہونے کی وجہ سے گویا مدار فیصلہ مقسم علیہ پر ہے ۔ لفظ کے مختلف استعمالات میں سے جو

استعمال مقسم علیہ سے بالکل ٹھیک ٹھیک لگ جائے اور جس سے دونوں کے درمیان ایک واضح اور خوبصورت مناسبت نمایاں ہو جائے پس سمجھنا چاہیے کہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

لیکن مقسم علیہ کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے سورہ نجم کا عمود (مضمون) واضح کر دیں۔

سورہ نجم ان سات سورتوں (از ق تا سورہ واقعہ) میں سے ایک ہے۔ جو اثبات قرآن میں نازل ہوئی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے قرآن کی حقانیت، برتری، پاکیزگی کی شہادت دے رہی ہیں (اس اجمال کو سمجھنے کے لئے علامہ فراہیؒ کی تفسیر سورہ ذاریات ملاحظہ فرمائیے) چنانچہ اس سورہ کے شروع و آخر میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اور بیچ میں جو باتیں عمود سے بظاہر بے تعلق نظر آتی ہیں۔ وہ بھی عمود کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن اس کی توضیح کے لئے ہم کو ایک لمبی بحث لکھنی پڑے گی جس کے لئے یہ جگہ مناسب نہیں۔ یہاں شہادت او دعویٰ یعنی قسم اور مقسم علیہ پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ ستاروں کے سقوط کو قرآن اور وحی اور پیغمبر صلعم کی صداقت کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ	ستارہ کی قسم جب وہ جھکتے ہیں کہ
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا	تمہارا ساتھی نہ بھٹکا نہ بہکا۔ اور نہ اپنے

يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ .... — جی سے باتیں بنانا، یہ تو وحی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے ....

.... وَلَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۝ — .... اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ان آیات پر غور کیجیے، قرآن، جبریل امین اور آنحضرت صلعم کو ہر طرح کی لغزش، گمراہی، کھوٹ وغیرہ سے بری اور محفوظ بتایا گیا ہے۔ وحی کے ساتھ حضرت جبریل اور آنحضرت صلعم کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ ایک واسطۂ وحی ہیں۔ اور ایک مہبطِ وحی۔ پس وحی کی حقانیت اور صداقت اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتی۔ جبکہ واسطہ اور مہبط کی قوت وحفاظت بھی واضح نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس سورہ میں ستاروں کے سقوط کی قسم کے بعد ان تینوں کا ذکر ایک ساتھ کیا اور اس طرح قرآن کی حقانیت وصداقت کی گواہی دی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ستاروں کے سقوط کو وحی، صاحب وحی اور حامل وحی کی صداقت سے کیا تعلق؟ مقدم الذکر بات موخر الذکر پر کیونکر دلیل وشہادت ہو سکتی ہے؟؟ یہ سوال ذرا ٹیڑھا ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن میں اس کے نظائر تلاش کریں اور ان کی روشنی میں اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

قرآن مجید میں ستاروں کے سقوط کی قسم کے ساتھ قرآن مجید کا ذکر دو تین

جگہ آیا ہے، پہلے ہم ان آیات کو نقل کرینگے اور اس کے بعد ان کے قدر مشترک پر غور کر کے قسم اور مقسم علیہ کے باہمی تعلق کی نوعیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرینگے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے سامنے سورہ واقعہ کی یہ آیات آتی ہیں فرمایا

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ۙ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۙ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۙ

بس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے گرنے کی اور سمجھو تو یہ بہت ہی بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن بڑی قدر و منزلت کا قرآن ہے اور ایک محفوظ کتاب میں ہے۔ اس کو صرف پاک فرشتے ہی چھو سکتے ہیں۔ پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ کیا تم لوگ اس کلام سے منکر ہوتے ہو۔

پھر اس سے زیادہ تفصیل اور مطابقت کا پہلو لئے ہوئے سورہ تکویر کی آیات نمایاں ہوتی ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُطَاعٍ

بس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے سیدھے چلتے دبک جانے والوں کی اور رات کی جب وہ پیچھے ہٹ جائے اور صبح کی جب وہ سانس لے۔ بیشک یہ ایک باعزت فرستادہ کا قول ہے جو قوت والا اور تخت کے مالک کے

ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝

پاس عزت والا ہے سب کا مانا ہوا اور معتبر ہے۔ اور تمہارا ساتھی مجنون نہیں ہے اور اس نے اس کو دیکھا ہے۔ آسمان کے کھلے کنارے میں اور وہ غیب کا بخیل (حریص) نہیں ہے اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔

ان تینوں مقامات کا ایک دوسرے کی نظیر اور شاہد ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ان تینوں میں ستاروں کی قسم ہے پھر ہر جگہ ان کے گرنے، غائب ہونے، پیچھے ہٹنے، چھپ جانے کا ذکر ہے۔ مقسم علیہ الفاظ میں گو مختلف ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے تینوں جگہوں میں ایک ہی ہے۔ قرآن کا باعزت، بلند اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بلند ہونا ہر جگہ مذکور ہے۔ ان تین میں سے دو مقامات میں حضرت جبریل کا طاقتور، مکرم، مطاع اور امین ہونا واضح لفظوں میں بیان ہوا ہے۔ اور ایک جگہ اشارۃً اس کا ذکر ہوا ہے علاوہ ازیں دو جگہوں میں آنحضرتؐ کو گمراہی، ضلالت اور جنون وغیرہ سے بری اور محفوظ قرار دیا گیا ہے۔

ان دونوں نظیروں کی روشنی میں اگر سورۂ نجم کی قسم اور مقسم علیہ پر غور کیا جائے۔ تو صحیح نتیجہ تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا ہے۔ اور دو واضح مطابقتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔

۱۔ منکرین رسالت کے متعلق معلوم ہے کہ وہ آنحضرت صلعم کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ یہ شخص کاہن یعنی ایک طرح کا عامل ہے اور اس نے جنات اپنے بس میں کر رکھے ہیں وہ غیب کی خبریں اس کو آکر بتا دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی تردید فرماتے ہوئے ستاروں کے سقوط سے شہادت پیش کی کہ خدا کے پردۂ غیب تک کسی شیطان و جن کی رسائی نہیں اور اگر کبھی کوئی شیطان کان لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ تو خدا کی طرف سے ایک شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرتا ہے۔ سورۂ حجر میں فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ ۝	اور ہم نے آسمان میں برج بنائے اور اس کو دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ کیا اور ہر شیطان مردود سے اس کی حفاظت کی مگر کوئی کان لگاتے تو ایک دمکتا شہاب اس کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔

سورہ والصافات میں ہے۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَارِدٍ لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ	اور ہم نے زینت دی سماء دنیا کو ستاروں سے اور محفوظ کیا ہر سرکش شیطان سے وہ ملاء اعلیٰ کی طرف کان بھی لگانے نہیں پاتے اور بھگانے کے لئے ہر طرف سے ان پر

مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ — شہاب پھینکے جاتے ہیں اور ان کے لیے
عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ — لازمی عذاب ہے مگر ہاں کوئی بات اگر کوئی
خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ — اُچک لے جاتا ہے تو شہاب کا دہکتا ہوا
شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝ — انگارا اس کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔

سورہ شعراء میں یہ مضمون اور بھی واضح ہو گیا ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ — اور اس قرآن کو (جیسا کہ کفار کہتے ہیں)
وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ — شیطان لے کر نہیں اترے اور نہ یہ کام ان
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ — کے کرنے کا ہے اور نہ وہ اس کو کر سکتے ہیں۔
وہ تو سننے سے بھی محروم رکھے گئے ہیں۔

پھر اسی سورہ میں ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے جن پر شیطان اترتے ہیں۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ — کیا میں تمہیں بتاؤں کن پر شیطان اترا
الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ — کرتے ہیں۔ اترتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار
اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ — پر جو کان لگاتے ہیں اور اکثر جھوٹے ہوتے
كٰذِبُوْنَ ۝ — ہیں۔

یہ مضمون قرآن مجید میں کئی جگہ بیان ہوا ہے اور شواہد بکثرت ہیں لقصد اختصار ان کا ذکر ہم اس وقت نظر انداز کرتے ہیں۔

اوپر مفسرین کے جو اقوال النجم کے متعلق ہم نے نقل کئے ہیں۔ ان میں

ایک مذہب یہ بھی ہے کہ اس سے ٹوٹنے والے نجوم مراد ہیں اور ہم نے اس کو دوسرے قول کے عموم میں داخل سمجھا ہے پس اگر یہ تاویل اختیار کی جائے تو قسم اور تم تلیہ میں ایک واضح تعلق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر جگہ ستاروں کے سقوط، وقوع اور پیچھے ہٹنے اور چل کر غائب ہونے کی قید ہی قسم کے ساتھ لگی ہوئی ہے پس اس روشنی میں اگر سورہ نجم کی ابتدائی آیات پر غور کیا جائے تو گویا ٹوٹنے والے تاروں کو شہادت میں پیش کر کے فرمایا کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى جس طرح سورہ تکویر میں فرمایا کہ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ یعنی پیغمبر کے متعلق تم جو یہ گمان کرتے ہو کہ وہ کاہنوں اور عاملوں کی طرح جنوں اور شیطانوں کی مدد سے غیب کی باتیں پیش کرتا ہے تو تمہارا یہ خیال غلط ہے پیغمبر اس طرح کی ضلالت و غوایت سے پاک ہے۔ کاہن جھوٹے اور ریا ٹھے ہوتے ہیں کیونکہ خدا کے غیب سے کوئی واقف نہیں۔ کوئی جن اور شیطان اگر کان لگاتا ہے تو خدا کے شہاب ثاقب اس کی سرزنش کرتے ہیں۔ مگر یہ کاہن جو افاک اور اثیم ہوتے ہیں اپنے جی سے من گھڑت فسانے سناتے ہیں۔ اور اس کو الہام غیب بتاتے ہیں۔ اور اس پیغمبر کا حال یہ ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

اس کے بعد پیغمبر صلعم کے واسطہ علم کا ذکر فرمایا کہ اس کا واسطہ علم کاہنوں کا شیطان نہیں بلکہ خدا کا جبریل امین ہے، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى

وہ زبردست طاقت والا ہے کوئی شریر طاقت اس کو مغلوب و متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ مردود و رجیم نہیں بلکہ صاحب عرش کے ہاں عزت والا اور مطاع و امین ہے۔ پھر یہ وحی کوئی خطفہ شیطانی اور نزغہ ابلیسی نہیں بلکہ قرب و اتصال کے چشمہ سے ابلی ہے۔ ثم دنیٰ فتدلّیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ پھر مہبط وحی کے قلب و نگاہ کی پاکی، ہوشیاری اور بیداری کی شہادت دی کہ ان تجلّیات و انوارِ گونا گوں اور مشاہدِ آیاتِ عظیمۂ بوقلموں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے چشم و دل کو حیران و درماندہ اور گوش و ہوش کو عاجز و سرگشتہ نہیں بنایا۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى - ..... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى

ہم نے بات مختصر کر دی ہے۔ ان مقامات کی تشریح کے لئے دفتر چاہیئے۔ اور جب تک لفظ لفظ اور آیت آیت کی گرہیں نہ کھول دی جائیں اس وقت تک اس تاویل کا اصلی حسن بے نقاب نہیں ہو سکتا جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ لیکن اس وقت ہم اس بحث کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہتے۔ انشاء اللہ پھر کسی جگہ ان آیات پر مفصل بحث کریں گے اس وقت صرف یہ مدنظر ہے کہ اس سورہ کی قسم اور مقسم علیہ کے متعلق غور کرنے کے لئے ہمارا نقطہ نظر بالا جمال سامنے آجائے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ستاروں کی پرستش دنیا کی قدیم ترین چیزوں میں

سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کی کواکب پرستی کا ذکر خود قرآن پاک میں نہایت تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ ان ستاروں کو قومیں مختلف قوتوں اور تصرفات کا مصدر سمجھتی تھیں۔ اور اس لئے ان کے بت بنا کر ان کو پوجتی تھیں۔ عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ستاروں کو مختلف اعتبارات سے ایک خاص روحانی حیثیت حاصل تھی۔ خود اس سورہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى کہہ کر اسی طرح کے ایک واہمہ کی تردید کی ہے۔ شعریٰ کے متعلق ایک شاعر کا یہ مصرعہ مشہور ہے:-

اذا ذکت الشعریٰ قبرد وظل۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عرب میں علم نجوم کو خاص اہمیت حاصل تھی اور جو لوگ اس میں دخل رکھتے تھے وہ گویا اسرار غیب کے کلید بردار سمجھے جاتے تھے۔

قرآن مجید نے عربوں کے اسی طرح کے تخیلات کی بنا پر ایک سے زیادہ مقامات میں کواکب و نجوم کی تسخیر، ان کے افول، ان کے سقوط۔ ان کے سجود اور ان کے ایک بندھے ٹکے اصول پر گردش کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس سے ثابت کیا ہے کہ جو خود دوسرے کے امر و فرمان کے آگے سربسجود اور محکوم و مجبور ہیں۔ وہ معبود و مسجود ہونے کی عزت کیسے پا سکتے ہیں۔ اور ان کو علم، قوت اور حیات کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ۔

پس ہو سکتا ہے کہ عربوں کے اس عام تخیل کے لحاظ سے ستاروں کے سقوط و سجود کو شہادت میں پیش کرکے پیغمبر صلعم اور وحی الٰہی کی صداقت ثابت کی ہو یعنی جس توحید کی دعوت ہے اس توحید کی گواہی آسمان کے ستارے بھی اسی ایک خدا کے سامنے جھک کر دیتے ہیں۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سورہ نجم میں قرآن کا اثبات، اثبات توحید کے پہلو سے ہے نیز اسی سورہ میں وَاَنَّهٗ هُوَرَبُّ الشِّعْرٰى بھی فرمایا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

سورۂ قمر
کی ایک آیت کے متعلق
سوال اور اس کا جواب

سورہ قمر کی آیت وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ
کے متعلق ایک عزیز دوست دریافت کرتے ہیں کہ :—
(۱) اس آیت کی صحیح تاویل کیا ہے ؟
(۲) اس آیت کو اس سورہ میں کیوں بار بار دہرایا گیا ہے ؟

آیت مسئول عنہا کی بابت مذکورہ بالا دونوں سوالات قرآن مجید کے ان تمام طلبہ کے ذہنوں میں پیدا ہونگے جو قرآن کا دقّت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اس جگہ ہم ان دونوں سوالات میں سے پہلے کا حل معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

آیت مسئول عنہا کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

کو حفظ کرنے کے لئے آسان کیا ہے اسی وجہ سے وہ بڑی سہولت سے یاد ہو جاتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں قرآن کے حفاظ موجود ہیں اور کوئی کتاب روئے زمین پر ایسی نہیں جسے یہ وصف حاصل ہو۔ ہمیں اس تاویل کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا بشرطیکہ قرآن کے اصول تاویل اس کی تائید میں ہوتے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اصول تاویل اس کی تائید میں مطلق نہیں ہیں۔ نہ لغت عرب سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ سیاق و سباق سے، نیز اس سورہ میں خطاب تمام تر ایسے لوگوں سے ہے جو سرے سے قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر ہیں۔ ایسے لوگوں سے امتنانی انداز میں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (اور ہم نے قرآن کو حفظ کرنے کے لئے سہل کر دیا ہے پس کیا کوئی قرآن کا حفظ کرنے والا ہے) بار بار کہنا صراحۃً بے جوڑ سی بات ہے۔

کسی آیت کا صحیح مفہوم اس وقت تک نہیں کھل سکتا جب تک کہ اس کے مشکل الفاظ کے معانی حل نہ کر لیے جائیں۔ آیت مسئول عنہا میں تین الفاظ محتاج تعبیر ہیں ان کی شرح کے بغیر آیت کا مطلب واضح نہیں ہو سکتا۔ وہ الفاظ یہ ہیں تیسیر ذکر، ادکار، لیکن مناسب ہوگا کہ ان کی شرح سے پہلے ایک ضروری اصول بیان کر دیا جائے جس کی رعایت اثنائے شرح الفاظ میں نہایت اہم ہے تا کہ طالب قرآن کو منزل مقصود تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

شرح الفاظ میں ایک ضروری اصول | قرآن مجید میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو کہیں تو وسیع معنی میں مستعمل ہوتے ہیں اور بعض جگہ محدود معنی میں مثلاً وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ" میں لفظ سجدہ نماز کی تعبیر کے لئے آیا ہے اور یہی لفظ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ میں تعظیمی سجدہ کے معنی میں مستعمل ہے یہاں اس سے نماز مقصود نہیں ہے، اس قسم کے بے شمار الفاظ قرآن پاک میں ہیں ان کے حل کی دو شکلیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ سباق و سباق کی روشنی میں ان کے مفہوم کا سراغ لگایا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ دیوان عرب کی مدد سے ان کا مفہوم متعین کیا جائے ۔ اگر قرآن کا طالب اس اصول سے کام نہ لے گا تو آیت کی تاویل میں نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں سے کہاں جا پڑے گا۔

اب ہم آیت مسئول عنہا کے محتاج تفسیر الفاظ کی بالترتیب شرح کرتے ہیں۔

(۱) تیسیر، لفظ تیسیر کی شرح میں سلف سے حسب ذیل اقوال پایۂ شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں۔

عن ابن جریرؒ	ولقد یسرنا القرآن	سهلناه، هوناه، بيناه	[ہم نے اسے آسان کر دیا ہم نے اسے بیان کیا ہے]
عن الرازیؒ	"	سهلناه	(ہم نے اسے سہل کر دیا۔)
عن الزمخشریؒ	"	سهلناه	(" " " ")

مذکورہ بالا شرح کے قبول کرنے میں دو زحمتیں ہیں۔ پہلی زحمت یہ ہے کہ موقع و محل جس وسعت کا یہاں متقضی ہے۔ اس شرح کے بعد وہ وسعت باقی نہیں

رہتی۔ دوسرے یہ کہ دیوان عرب سے اس معنی کی تائید نہیں ہوتی لغت عرب میں تیسیر کے معنی آسان کرنا نہیں ہے بلکہ اصل معنی اس کے کسی چیز کو کسی چیز کے قابل بنانا اور موزوں بنانا ہے، چنانچہ اہل زبان کا یہ مشہور استعمال ہے۔

یَسَّرَ نَاقَتَہٗ للسفرو — اس نے اپنی اونٹنی سفر کے لئے موزوں بنا دی اور

یَسَّرَ فَرَسَہ للغزوِ — اپنے گھوڑے کو لڑائی کے قابل بنا دیا یعنی اونٹنی کی پشت پر کاٹھی کس دی اور اسے سفر کرنے کے لائق بنا دیا۔ اور گھوڑے پر زین لگا دی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ لڑائی میں لے جایا جائے۔

ایک حماسی شاعر کہتا ہے

ونعین فاعلنا علی ما نابہ — حتی تیسرہ لفعل السید

اور ہم اپنے میں متحرک شخص کی مدد کرتے ہیں جب وہ مصیبت میں گھبراتا ہے یہاں تک کہ اسے سرداری کے قابل بنا دیتے ہیں۔

سلف میں سے امام زمخشریؒ نے جنہیں لغت عرب کا سرتاج کہنا چاہیئے اس حقیقت کی طرف خفیف اشارہ کیا ہے۔ مگر چونکہ جمہور مفسرین اس بارے میں اور رائے رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی طرف ویجوز کہہ کر اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

ویجوز یسرنا القرآن للذکر — اور جائز ہے کہ یسرنا القرآن للذکر کے

ای ھَیَّئْنَاہُ لِلذِّکْرِ مَنْ یَتَیَسَّرَ | معنی یہ لئے جائیں کہ ہم نے قرآن کو یاد دہانی
نَاقَتَہٗ لِلسَّفَرِ اِذَا رَحَلَھَا الخ | حاصل کرنے کے لئے موزوں بنایا ہے اور یہ معنی

بَیَسَّرَ نَاقَتَہٗ لِلسَّفَرِ سے ماخوذ ہے۔

(۲-۳) ذکر اور ادکار کے معنی عام طور پر حفظ کے لئے گئے ہیں لیکن لغت عرب سے یہ صریح انحراف ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یہ الفاظ لغت عرب میں کبھی استعمال کئے گئے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی یہ لفظ متعدد جگہ آیا ہے لیکن کسی جگہ اس معنی میں نہیں آیا ہے۔ لغت عرب اور قرآن پاک دونوں میں عموماً یہ لفظ کسی بھولی بسری چیز کے یاد آ جانے یا یاد دلانے کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں سورۂ یوسف میں ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْھُمَا وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّۃٍ اَنَا اُنَبِّئُکُمْ بِتَاوِیْلِہٖ الآیۃ | اور کہا اس شخص نے جو بچا تھا ان دونوں میں سے اور یاد آیا اسے کچھ دیر بعد میں تمہیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں"

سورہ اعلیٰ میں ہے

سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی | جلد نصیحت کرے گا وہ جس میں خشیت ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ ذکر کی تشریح میں وہی راہ اختیار کی ہے جو عام لوگوں کی ہے لیکن لفظ ادکار کا مفہوم وہ لیا ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

فهل من مدكر ای متذکر لان الافتعال والتفعل کثیرا ما یجی بمعنی مدکر وعلی هذا فلو قال قائل هذا یقتضی وجود امر سابق منسی نقول ما فی الفطرة من الانقیاد للحق هو کالمنسی فهل من مدکر یرجع الی ما فطر علیہ۔

مدکر کے معنی متذکر کے ہیں اس لئے کہ افتعال اور تفعل اکثر ہم معنی آتے ہیں اس صورت میں اگر کوئی کہے کہ اس مفہوم کا اقتضا تو یہ ہے پہلے ایک چیز موجود ہو اور پھر اس کا ذہول ہو گیا ہو، امام صاحب فرماتے ہیں اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ ہر انسان کی فطرت میں قبول حق کا جوہر موجود ہوتا ہے لیکن اس پہ پردہ پڑ جاتا ہے اس لئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ کیا کوئی ہے جو اپنی فطرت کا بھولا ہوا سبق حیت کرے۔

آیت کی جامع و مانع تاویل

اب لغت عرب اور اصول قرآن کی روشنی میں اس آیت کی تاویل یہ ہوئی کہ قرآن مجید فطری تعلیم کی یاد دہانی کے لئے ہر پہلو سے موزوں بنایا گیا ہے یعنی حقائق و کلیات ثابت کرنے کے لئے اس میں ہر طرح کے عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں جن کے بعد انہیں نہ ماننا سراسر ہٹ اور ضد ہے۔

تنزیل و تاویل

اقسامِ قرآن

”وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۲ وَشَاهِدٍ ۳ وَّمَشْهُوْدٍ ۴“

ہر طالب قرآن کے ذہن میں مذکورہ بالا سورہ (بروج) کے مطالعہ کے وقت قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان قسموں کا کیا مقصد ہے؟ یہ جواب تو قرین قیاس نہیں ہوگا کہ خدا نے ان چیزوں کی احتراماً قسم کھائی ہے........ کیونکہ خدا سے اعلیٰ و اجل آسمان و زمین میں کوئی چیز نہیں ...... نفس یہ سوال کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن پاک میں کیوں قسمیں کھائی ہیں بہت اہم ہے۔ اکابر علماء نے بھی اس کی اہمیت محسوس کی ہے چنانچہ بعضوں نے تو اس کی تحقیق میں مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں علامہ ابن قیمؒ اور امام رازی رحمۃ اللہ کو خصوصیت کبریٰ حاصل ہے۔ ان دونوں اماموں نے ایک بڑی حد تک اس کی گتھیاں سلجھائی ہیں

متقدم الذکر نے تبیان کے نام سے اس پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے لیکن موخر الذکر کی اس پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے ۔ بلکہ جن جن سورتوں میں قسمیں وارد ہیں، ان میں سے اکثر کے متعلق انہوں نے اپنی کتاب (تفسیر کبیر) میں بحث کی ہے ۔۔۔۔۔۔

بیسویں صدی کے ایک عالم نے بھی اس سوال کی تحقیق میں (امعان فی اقسام القرآن) کے نام سے ایک نہایت ہی جامع رسالہ لکھا ہے اور غالباً اس مسئلہ کی تحقیق میں اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب منصۂ شہود پہ نہیں آئی ہے لیکن اس مقالہ میں اس کی تفصیل کی بالکل گنجائش نہیں، اس لئے اس بحث کو دوسری صحبت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے، انشاء اللہ پھر کبھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس پہ بحث کی جائے گی ۔۔۔۔۔۔۔ اب محض سورہ بروج کی قسموں کا مقصد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔۔۔۔ لیکن پیش نظر سورہ کی قسموں کا منشا دریافت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اجمالاً پہلے نفس قسم کا مفہوم متعین کر دیا جائے ورنہ حقیقت کے سراغ لگانے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لئے چند الفاظ میں پہلے نفس قسم کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا ۔

عام طور پر لوگوں نے قسم اور تعظیم کا چولی دامن کا واسطہ سمجھ رکھا ہے اس نظریہ کی بنا پر قرآن پاک کی قسموں کی حکمت ان پر مخفی رہی اور باوجود انتہائی کوشش کے بھی ان کی حقیقت کا دروازہ ان پہ بند رہا ۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے ۔ کہ قسم کا مقصد شہادت ہے ۔۔۔۔۔ ہاں اگر مقسم بہ کوئی محترم چیز ہو تو لا محالہ

شہادت کے ساتھ تعظیم کا بھی پہلو ہو گا۔ ورنہ محض شہادت ہی کا مثلاً وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا، فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا، فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ان قسموں میں محض شہادت ہی کا پہلو ہے۔ ورنہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ، ق وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ۔ وَالْقُرْاٰنِ ذِى الذِّكْرِ۔ فَلَا وَرَبِّكَ الآیہ میں شہادت اور احترام دونوں پہلو ہیں۔ الغرض قرآن پاک کی بعض قسمیں تو محض شہادت پر مشتمل ہیں، اور بعض میں شہادت اور احترام دونوں مدنظر ہیں۔

قسم کا یہ مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ہم اسی کی روشنی میں سورۂ بروج کی قسموں کا منشاء دریافت کریں گے، لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے مقسم علیہ کی تعیین کر لی جائے۔ تاکہ قسموں کے صحیح مفہوم کی تعیین میں کسی طرح کی دقت نہ پیش آئے۔

سورہ بروج کی شہادتوں کا مرکز:۔ ہم نے جہاں تک سیاق وسباق کی روشنی میں پیش نظر سورہ کی شہادتوں کے مقسم علیہ کی بابت غور و فکر کیا ہے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ شہادتیں دینونت پر پیش کی گئی ہیں، دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان شہادتوں سے خدا نے اپنی سنت مجازات (دنیا و آخرت دونوں میں) پر استدلال کیا ہے! اور اسی کی تائید ما قبل وما بعد کی سورتیں بھی کرتی ہیں اور یہی آراء اس بارے میں جمہور مفسرین رح کی بھی ہیں، لیکن جب مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت کا سوال ہوتا ہے، تو تقریباً سب خاموش نظر آتے ہیں

.... ہم نے ایک مناسبت تلاش کی ہے، لیکن قبل اس کے کہ اسے پیش کیا جائے، مناسب ہوگا کہ ایک نہایت ہی ضروری مرحلہ سے گذر دیا جائے جو اس سے کہیں زیادہ کٹھن اور دشوار گذار ہے، وہ پیش نظر سورہ کی قسموں کی تعیین ہے اور دراصل اسی نے مفسرین رحمہم اللہ کے لبوں پر مہر سکوت لگادی ہے،

سورۂ بروج کی شہادتوں کی شرح اور تعیین:- (۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ پہلی شہادت آسمان کی پیش کی ہے۔ اور اس کی صفت برجوں والا بیان کی ہے اس امر میں اختلاف ہے۔ کہ بروج سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے قصور سماوی مراد ہیں، اور بعض بزرگوں کے نزدیک اس سے کواکب مراد ہیں اور بعض حضرات اس سے چاند و سورج کی منازل مراد لیتے ہیں، یہی تین اقوال حد شہرت کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان تینوں اقوال میں سے کسی ایک کے بھی لینے میں کوئی خرابی نہیں، اس پر تفصیلی بحث مناسبت کے سلسلہ میں آئے گی۔

(۲) اَلْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ یہ دینونت پر دوسری شہادت ہے اس کے بارے میں سب کے سب متفق اللفظ ہیں کہ اس سے روز جزا مراد ہے،

(۳، ۴) وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ان دونوں شہادتوں کے بارے میں سلف کے بے شمار اقوال کتب تفاسیر میں مذکور ہیں .... ہم ان میں سے دونوں کے متعلق چند مشہور اقوال تفسیر کبیر سے نقل کرتے ہیں۔ (۱) شاہد جمعہ، انسان، محمد، قربانی کا دن، اللہ، کائنات۔

۲۔ مشہود ؓ عرفہ، قیامتؓ جمعہ، انسانؓ، ہمارے نزدیک مذکورہ بالا اقوال میں اَقْرَبُ اِلَی الصَّوَاب دو قول ہیں۔

(۱) وہ لوگ جو شاہد سے کائنات مراد لیتے ہیں۔ تفسیر کبیر جلد ۸)

(۲) وہ لوگ جو مشہود سے انسان مراد لیتے ہیں یعنی یوں وہ تاویل کرتے ہیں، کہ انسان خود اپنے خلاف شاہد ہے، اور ان کے استدلال کی بنا قرآن پاک کی ان آیات پر ہے)

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۴- نور)

اس روز (قیامت) ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور پاؤں خود کردہ کی اپنے شہادت دیں گے۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

حم سجدہ (۲۰)

وہ کہیں گے اپنی کھالوں (اعضاء) سے تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔ تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے۔ کہ وہ بولا رہا ہے جس نے تمام چیزوں کو نطق عطاء کیا ہے۔ اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اور اس کے پاس تم پھر لوٹائے جاؤ گے۔

(ھذا قول الخراسانی تفسیر کبیر جلد ۸)

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیش نظر سورہ کا جو مقسم علیہ ہم نے ٹھہرایا ہے اس میں اور قسموں میں مناسبت ہے یا نہیں؟

مقسم بہ اور مقسم علیہ میں مناسبت: تفصیل بالا سے یہ تو ثابت ہو گیا ہوگا کہ یہ چاروں شہادتیں ایک ہی دعوی کے اثبات میں پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں کہ مجازات کا قانون یقینی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے بنا پر بہت سی قومیں صفحہ ہستی سے یک قلم مٹا دی گئیں فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ" اور اس کے ظہور کا اصلی دن قیامت ہوگا يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ عس پ۳ع ۱۴۵) رہا یہ سوال کہ آخر ان شہادتوں اور دعوی میں کیا مناسبت ہے، یہ بہت ہی اہم ہے۔ اس لئے اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اس کی صورت یہ ہے کہ چاروں قسموں کو لے کر الگ الگ مقسم علیہ سے ارتباط دکھلایا جائے

(۱) وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ" یہ شہادت وقوع وثبوت پر پیش کی گئی ہے اور اس کی صفت برجوں والی قرار دیا ہے، ...... ہم بروج کی شرح میں کہہ چکے ہیں۔ کہ اس سے خواہ قصور سماوی مراد لیں یا کواکب لامعہ یا منازل شمس وقمر، ہر ایک کا احتمال ہے اور معنی میں کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ بروج سے قصور سماوی مراد لیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ سقف نیلگوں وقوع وثبوت پر شاہد ہے بروج کی قید اس لئے لگا دی کہ مخاطب اس کی طرف دیدۂ اعتبار سے دیکھ کر ایک صاحب جلال و جبروت اور تماول بادشاہ کا تصور قائم کرے! اور اگر بروج سے کواکب مراد لیں تو اس کے

یہ معنی ہوں گے کہ یہ درخشاں تاروں سے منظم آسمان وقوع جزا پر شاہد ہے۔ اور اگر ان سے چاند و سورج کی منزلیں مراد لیں تو اس کا یہ مفہوم ہوگا۔ کہ یہ آفتاب و ماہتاب کا ایک خاص نظام کے ماتحت گردش کرنا اور ہر ایک کا اپنے اپنے دائرہ میں چکر لگانا شاہد ہے کہ یہ شے چرپوں ہی آپ سے آپ نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ اس کا ضرور کوئی نہ کوئی موجد ہے جو ہر طرح کے صفات کمالیہ سے موصوف ہے۔ تو ضرور اس نے اس عالم کے وجود میں لانے کا کوئی نہ کوئی مقصد پیش نظر رکھا ہوگا۔ اس کو ہم قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اصل سوال علی حالہ باقی رہا یعنی مناسبت کا سوال۔ اس کے سمجھنے کے لئے اصولی طور یہ بات یاد رکھنی چاہئے۔ کہ قرآن مجید اثبات حقائق (اصول دین) میں کبھی تو عالم علوی کی چیزوں سے کام لیتا ہے۔ کبھی عالم سفلی سے اور کبھی نظام انسانی کو دلیل میں پیش کرتا ہے یہاں ہمیں ان تمام دلائل سے بحث نہیں ہے بلکہ پیش نظر سورہ کی قسموں (شہادتوں) کے سمجھنے کے لئے صرف ان شہادتوں کی (خواہ وہ بطور قسم کے استعمال میں آئی ہوں آیت اور عبرت کے اسلوب میں) حکمت سے بحث کرنی ہے۔ جو نظام علوی یا سفلی سے متعلق ہے" ہمارے خیال میں نظام فوقانی کو بار بار شہادت میں اس لئے پیش کیا گیا۔ کہ انسان اس نظام پر غور و فکر کر کے ایک ایسی ذات تک پہنچے۔ جس کی حکمت لامحدود ہے جس کا علم ساری کائنات کو محیط ہے۔ جس کی قدرت بے پناہ ہے۔ اور جس کے ادنے اشارہ سے یہ سارا نظام آناً فاناً میں درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اور عالم سفلی کے شہادت میں پیش کرنے کی یہ حکمت ہے۔ کہ انسان اگر ان مصنوعات باری پر بھی نظر ڈالے جو ہم ان

اس کی نظروں کے سامنے ہیں تو وہ محسوس کرے گا۔ کہ ان میں سے ہر ایک زبان حال سے ایک صاحب جلال و جبروت کی گواہی دے رہی ہے۔ سورہ جاثیہ میں ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ بیشک آسمانوں اور زمین میں مومنین کے لئے وجود باری پر شہادتیں ہیں۔ (۳۔ جاثیہ)

ایک دوسری جگہ مذکور ہے۔

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (۱۹۰ آل عمران۔) بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات و دن کی گردش میں سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے (نظام عالم کے باغات ہونے پر) دلائل ہیں۔

سورہ یونس میں ہے۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۔ بے شک رات دن کی گردش میں اور جو کچھ آسمان اور زمین میں خدا نے پیدا کیا ہے اہل تقویٰ کے لئے (وجود باری پر) .... دلائل ہیں (۶۔ یونس)

انہی شہادتوں کو قرآن پاک نے قسم کے اسلوب میں بھی پیش کیا ہے ملاحظہ ہو

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (طارق) شاہد ہے آسمان اور ستارے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۔ شاہد ہے سورج اور اس کی روشنی اور چاند جبکہ اس کے پیچھے آئے اور دن جبکہ اسے (دنیا) پیدا کر دے اور . . . . . . رات جبکہ اسے ڈھانک لے اور آسمان اور اس کی

(۷ - الشمس) صنعت اور زمین اور اس کی گستردگی، اور انسان
اور اس کا ..... (قوی کا لیے سے) مزتین ہونا۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى (۱- نجم) شاہد ہے ستارہ جبکہ ڈھل جائے۔

پیش نظر سورہ کی پہلی شہادت نظام فوقانی ہی سے متعلق ہے یعنی اس چرخ کو شہادت میں پیش کر کے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا یہ چرخ آپ ہی آپ چل رہا ہے ظاہر ہے کوئی بھی اس معلول کو خود اس کی علت قرار نہ دے گا بلکہ سب کے سب ایک ایسی طاقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ جو اس پورے نظام کو چلا رہی ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اس کا مدبر کوئی معمولی نہیں ہے ۔اس لئے کہ ایسے عظیم الشان نظام کا اس پابندی کے ساتھ چلانا کسی معمولی طاقت کا کام ہونا خلاف عقل و مشاہدہ ہے، تو ضرور ہے۔ کہ اس کا مدبر ہر طرح کے صفات کمالیہ (حکمت، قدرت، ربوبیت، عدل، رحمت) کا جامع ہوگا۔ اس کو ہم خدا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ ان صفات کمالیہ سے متصف ہے (اور یقیناً ہے) تو ضرور ہے کہ اس نے یہ سقف نیلگوں اور یہ فرش زمردین یونہی بلا مقصد نہیں بچھائی ہوگی۔ بلکہ اس کے یہ تمام مظاہر قدرت اس کی اعلیٰ رحمت کے ظہور کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس کو ہم دینونت سے تعبیر کرتے ہیں خود قرآن پاک میں وقوع قیامت کو رحمت ایزدی کا سبب ٹھیرایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو،

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہو آسمان اور زمین کس کی ملکیت ہیں؟ کہو خدا
قُلْ لِّلّٰهِ ۔كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ کی اس نے اپنے اوپر رحمت فرض کرلی ہے کہ وہ

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ - الآيٰت (۱۲ - انعام) ضرور تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا - اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

خلاصہ یہ کہ پیش نظر سورہ کی پہلی شہادت (وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ) ہے اس کے موجد پر استشہاد کیا ہے۔ اور اس (موجد باری تعالیٰ) کے صفات سے وقوع دینونت پر استدلال کیا ہے اور صفات سے کلیات دین پر استدلال قرآن پاک میں بہت شائع و ذائع ہے۔

(۲) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ یہ وقوع دینونت پر دوسری شہادت ہے سوال ہو سکتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ ایک ہی چیز دعویٰ بھی اور دلیل بھی! لیکن اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے اس لئے کہ بعض چیزیں ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو اپنے اثبات کے لئے خارجی دلائل کی بالکل محتاج نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دعویٰ اور دلیل دونوں کا کام دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے، کہ اگر آپ سے کوئی ٹھیک بارہ بجے دن میں یہ سوال کرے کہ کیا دلیل ہے۔ کہ اس وقت رات نہیں دن ہے؟ تو اس کا بہترین جواب تو یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ اور اگر جواب ہی دینا چاہتے ہوں تو یہ مصرع پڑھ دیجئے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب اور اس کے اثبات کے لئے منطقی دلائل و براہین کی جستجو میں پڑے گا، تو یقین رکھئے کہ اس کی صداقت کو آپ اجاگر نہ کریں گے۔ بلکہ اس پر اور پردہ ڈالیں گے ......

یہی صورت حال زمانہ نزول قرآن میں بھی تھی۔ کفار وقوع قیامت پر آیات نہایت مانگتے چونکہ یہ چیز بدیہی تھی۔ اس لئے کہ بغیر اس کے ماننے کائنات کا بطلان لازم آتا

ہے، قرآن نے کہیں تو اس کے اثبات کے لئے اپنی صنعت حکمت و قدرت سے کام لیا ہے اور بعض جگہ اظہار ہدایت کے لئے اسی کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ بعینہٖ اسیطرح اثبات صداقت قرآن کے باب میں بھی بعض جگہ تو اس کے منزل من اللہ ہونے پر دلائل عقلیہ و فطریہ کا انبار لگا دیا ہے۔ اور بعض جگہ قرآن پاک ہی کو شہادت میں پیش کر دیا ہے، تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

(۳) وَشَاهِدٍ یہ وقوع و ہونٹ پر شہادت ہے ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اس سے کائنات مراد ہے یعنی وقوع جزا پر اس کائنات کا ذرہ ذرہ زبان حال سے شہادت دے رہا ہے۔ یہ کوئی انوکھا استشہاد نہیں ہے۔ قرآن نے اس تعمیم کے ساتھ اور مواقع پر بھی استدلال کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ شاہد ہیں مرئیات (عالم سفلی) اور غیر مرئیات (عالم اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۲۹۔ حاقہ) علوی) یہ ایک بزرگ فرستادہ کا کلام ہے۔

دیکھئے مذکورہ بالا آیات میں لفظ "بِمَا تُبْصِرُوْنَ" جس سے یہ پورا عالم ظاہر مراد ہے۔ شہادت میں پیش کیا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر بھی یہی تعمیم ہے۔

اِنَّ فِيْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۲ یونس) بیشک لیل و نہار کی گردش میں اور جو کچھ کہ خدا نے۔ آسمان و زمین میں پیدا کیا ہے اہل تقویٰ کے لئے

دلائل (وجود باری پر) ہیں۔

دیکھئے مذکورہ بالاآیت کے اس ٹکڑے (وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)
میں بھی وہی تعمیم ہے یعنی عالم ظاہر و باطن کا ایک ایک ذرہ زبان حال سے خدا کی وحدانیت
اور وقوع جزا کے وجوب کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

(۴) وَمَشْهُوْد یہ وقوع و ثبوت پر چوتھی شہادت ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس
سے انسان مراد ہے .... دعویٰ اور دلیل کے ارتباط کے باب میں اگر آپ
امکان نظر سے کام لیں گے تو مختلف وجوہ سے انسان کا وجود وقوع و ثبوت پر شاہد
نظر آئے گا۔

انسان کا وجود دلیل قیامت ہے :۔ یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ دنیا میں جتنی موجودات
ہیں ہر ایک کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی مقصد ہے پس ضرور ہے کہ انسان کے وجود کا
بھی کوئی مقصد ہو یہ تو صحیح نہیں کہ اس کا وجود محض اس لئے ہُوا ہو کہ چند دن لذائذ دنیوی
سے متمتع ہو کر پیوند خاک ہو جائے۔ اگر یہی مقصد ہے تو یہ بہت ہی گھٹیا ہے۔ اور اس
کو وجود میں لانے والا حکیم نہیں ہو سکتا جب اس کا صانع ایک حکیم ہے تو یقیناً اس کی
ایجاد کا کوئی مقصد ہو گا۔ یہی مقصد اور غایت ہے جس کا ظہور اس دن ہو گا۔ جب کہ
عدالت کبریٰ قائم ہو گی۔ اس لئے بے شمار جگہ خدا نے قرآن پاک میں نفس انسان کو دلیل
معاد ٹھیرایا ہے۔"

سورہ قیامت میں ہے۔ وَلَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲ قیامۃ)

(۲ قیامہ) اور شاہد ہے نفس لوّامہ۔

ایک دوسری جگہ مذکور ہے۔

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ خود تمہارے وجود میں (وقوع قیامت پر) بے شمار دلائل ہیں۔

(۲ ذاریات)

سورۂ شمس میں ہے۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (۷ شمس) اور انسان اور اس کی تخلیق عجیب شاہد ہے۔

ایک دوسرے مقام پر یوں ہے۔

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۳۔ دلیل) اور شاہد ہے مذکر اور مؤنث مخلوق۔

(۴) انسان کا عجز اور اس کی بے بسی: ۔ قرآن پاک میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار خدمات پر خدا نے انسان کی بے بسی و لاچاری سے بھی وقوع قیامت پر استدلال کیا ہے۔ سورۂ طارق میں ہے۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ

انسان کو غور کرنا چاہئے کہ کس چیز سے اس کا وجود ہوا ہے؟ اچھلتے ہوئے پانی سے جو نکلتا ہے۔ ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے۔ ضرور وہ انسان کے دوبارہ وجود میں لانے پر قادر ہے۔ جس دن کہ دل کی باتوں کی جانچ ہوگی اور نہ ہوگا اس کا کوئی یار و غمگسار۔

ایک اور مقام پر یوں وارد ہے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ کتنی حقیر شے سے اسے پیدا کیا ہے، صاف شفاف
خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ثُمَّ السَّبِيْلَ پانی سے، اولاً اس کی تخلیق کی، پھر اس کی تقدیر کی
يَسَّرَهٗ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ پھر راستہ اس کے لئے آسان کر دیا۔ پھر اسے مردہ
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۱۸-۲۲ عبس) کر کے قبر میں ڈال دیا، پھر جب چاہے گا اٹھا کھڑا کرے گا

سورہ قیامہ میں ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ آیا انسان کا یہ خیال ہے کہ وہ یوں ہی چھوڑ دیا
سُدًى اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ جائے گا، کیا وہ اس سے پہلے بے حقیقت
مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ قطرہ نہ تھا۔ پھر منجمد خون کی صورت میں ہو گیا۔
فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ اولاً اس کی تخلیق کی پھر اسے آراستہ کر دیا۔ پھر
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ اس نے پیدا کیا۔ اس سے مذکر اور مؤنث کیا وہ
بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (۳۶-۴۰) از سر نو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔
قیامہ

لا اقسم بھٰذا البلد

(نہیں، مجھے قسم ہے اس شہر کی)

قرآن مجید میں سورہ بلد کی قسمیں بھی غور و تدبر کی محتاج ہیں، ہم ذیل میں مختصراً
ان پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

بلد کے بارے میں مفسرین کرام کا اتفاق ہے کہ اس سے سرزمین مکہ مراد ہے
البتہ والد و ما ولد کی قسم کے بارے میں ان کی رائیں مختلف ہیں ہم ذیل میں ان کی رایوں
کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

۱۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ والد سے حضرت آدمؑ اور ما ولد سے ان کی
ذریت مراد ہے۔

۲۔ بعض بزرگوں کے نزدیک والد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ما ولد سے

ان کی ذرّیت مراد ہے۔

۳۔ بعض لوگ والد سے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو اور ما ولد سے محمد صلعم کو مراد لیتے ہیں۔

۴۔ بعضوں کے نزدیک والد وما ولد عام ہیں۔ ان سے کوئی مخصوص ذات مقصود نہیں۔ بلکہ عام اولاد آدم مراد ہے۔

یہ چاروں اقوال بظاہر مختلف نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف محض لفظی ہے۔ "والد وما ولد" کے عموم کو باقی رکھتے ہوئے ہم اس سے حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام اور ان کی ذرّیت کو مراد لے سکتے ہیں۔ یہ ایک عام لفظ اپنی عمومیت کو باقی رکھتے ہوئے ایک خاص مفہوم کی طرف بھی اشارہ کرے گا اور یہ اشارہ "وَأَنتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ" کے الفاظ سے نمایاں بھی ہو گیا ہے۔ پس ہمارے نزدیک یہ اسلوب معنی عام اور معنی خاص دونوں کا حامل ہے۔ اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر سورہ والعصر کی پہلی فصل اس باب میں رہنمائی کرے گی۔

یہ جان لینے کے بعد کہ بلد سے شہر مکہ اور والد وما ولد سے عام اولاد آدم اور بالخصوص بنی اسمٰعیل مراد ہیں۔ تحقیق طلب بات یہ ہے۔ کہ ان قسموں کا مقسم علیہ کیا ہے؟ اور قسم اور مقسم علیہ میں مناسبت کیا ہے؟ یہ دونوں سوال بہت اہم ہیں اور انھیں کے حل پر اس بحث کا فیصلہ ہے۔ لیکن مقسم علیہ کی پوری تفصیل بغیر مضمون

سورہ معلوم کئے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے پہلے ہم پیش نظر سورہ کا عمود بیان کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد دلیل و دعوی یعنی قسم اور مقسم علیہ میں مناسبت کے پہلو واضح کریں گے۔

سورہ کا ترجمہ یہ ہے۔

"نہیں، مجھے قسم ہے اس شہر کی، اور تو اسی شہر میں مقیم ہے اور باپ اور بچے کی، کہ بےشک ہم نے آدمی کو تکلیف میں پیدا کیا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا۔ کہتا ہے کہ ہم نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کیا نہیں دیں ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان دو لب اور سوجھائیں اسے دو راہیں۔ سو وہ گھاٹی میں نہ گھسا اور کیا سمجھا گھاٹی کو۔ گردن کا چھڑانا ہے یا قحط کے دن کھلانا ہے۔ رشتہ دار یتیم کو یا خستہ حال مسکین کو۔ پھر ان میں سے ہو جو ایمان لائے۔ اور ایک دوسرے کو صبر اور ترس کھانے کی نصیحت کرتے رہے۔ یہی لوگ خوش نصیب ہیں۔ اور جنھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا۔ وہ بدنصیب ہیں وہ آگ میں بند ہوں گے۔"

اس سے نہایت صاف واضح ہے کہ اس سورہ میں مخاطب قریش کے وہ دولتمند اور مالدار لوگ ہیں، جو خدا کے فضل اور اس کے گھر کی تمام برکت سے متمتع ہونے کے بعد شکر کے بجائے کفر اور خدمت خلق کے بجائے استکبار اور زمین میں فساد کے مرتکب

ہوتے اور خود بخل کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے تھے ان لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے انسان کے مشقت میں پیدا ہونے کا ذکر فرمایا اور اس مشقت پر سرزمین مکہ اور باپ اور بچے کی قسم کھائی۔ اور پھر یاد دلایا کہ جس خدا نے تمہاری اس مشقت کو دور کر کے تمھیں طرح طرح کی نعمتیں دیں، افسوس ہے کہ تم اس کی نعمتوں کا شکر نہیں ادا کرتے۔

مکہ کی سرزمین کا پر مشقت ہونا ایک ایسی واضح بات ہے۔ کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ایک ایسی سرزمین کہ جس میں نہ پانی ہے، نہ غلہ، نہ کھیتی کے لئے زرخیز زمین کے میدان ہیں، نہ جانوروں کے لئے شاداب چراگاہ۔ ایک چٹیل اور بے گیاہ سرزمین تھی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کو بسایا اور دعا فرمائی کہ

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ	اے ہمارے پروردگار میں نے تیرے معزز
ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ	گھر کے پاس اس بیابان میں جہاں کھیتی نہیں
زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ	اپنی اولاد بسائی ہے تاکہ اے ہمارے پروردگار
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں، پس لوگوں کے
فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ	دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے ۔۔۔۔۔۔
تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ	اور پھلوں سے انھیں روزی دے تاکہ یہ تیرا
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ	شکر کریں۔

اس دعا کی برکت کا یہ اثر ہوا۔ کہ یہ ویران سرزمین اہل عرب کے لیے جنت ارم

بن گئی۔ یہاں امن نہ تھا۔ وہاں اس گھر کی برکت سے امن ہو گیا۔ جہاں کھیتی باڑی کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے پھلوں کی روزی دی، جو ایک چٹیل میدان میں بالکل تنہا تھے۔ وہ تمام دنیا کے دلوں اور ان کی محبتوں کے مرکز بن گئے۔ یہی وہ مخصوص انعامات ہیں جن کو اللہ نے سورۃ القریش میں یاد دلایا ہے۔ اور ساتھ ہی ان انعامات و برکات کا جو حق ہے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

"اس لئے کہ قریش کو الفت بخشی جائے اور گرمی کے سفر میں تو ان کو چاہیئے کہ عبادت کریں۔ اس گھر کے خداوند کی جس نے انھیں کال میں کھلایا اور ڈر میں بخشت کیا"

دوسری جگہ اپنے اسی فضل خاص کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَقَالُوٓا اِنۡ نَّتَّبِعِ الۡهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفۡ مِنۡ اَرۡضِنَا ؕ اَوَلَمۡ نُمَكِّنۡ لَّهُمۡ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجۡبٰٓى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ رِّزۡقًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

اور وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ دین حق کی پیروی کریں تو ہم اپنی جگہ سے اُچک لئے جائیں گے۔ کیا ہم نے ان کو حرم میں جہاں ہر طرح کا امن ہے جگہ نہیں دی۔ ہر قسم کے پھل یہاں کھینچے چلے آتے ہیں۔ ہمارے یہاں سے یہ رزق ہے۔ لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے ہیں۔

یہ وہ فضل و کرم ہے جو اہل عرب پر بیت اللہ کی برکت سے نازل ہوا اور یہ بہ مشقت

سرزمین ان کے لئے امن کا گہوارہ، نعمتوں اور برکتوں کا سرچشمہ، عنایتوں اور نوازشوں کی فردوس بن گئی

علاوہ انہیں عرب کے مخصوص حالات کے لحاظ سے عام نعمتیں بھی ان کو ایسی حاصل ہوئیں جوان کو شکر کی دعوت دینی تھیں۔ مثلاً سورہ نحل میں فرمایا

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النحل۔۵)

اور چوپائے تمہارے لئے پیدا کئے جنہیں تمہارے لئے گرمی کا سامان اور دوسرے فوائد ہیں۔ اور ان سے تم کھاتے ہو اور تمہارے لئے ان میں جمال زینت ہے جبکہ شام کو تم ان کو چرا کر واپس لاتے ہو اور صبح کو چراگاہ لے جاتے ہو اور یہ تمہارے بوجھ ایسے شہروں تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر انتہائی مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بیشک تمہارا پروردگار مہربان اور رحم والا ہے۔

عرب جیسی سرزمین میں جہاں انسانی تدبیروں کی درماندگی اور بے بسی سب سے زیادہ نمایاں ہے اور ہر قدم پر انسان وسائل کار اور اسباب معیشت کی کمی کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھتا لیکن ساتھ ہی اپنے کو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں

کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے۔ اگر انسان اپنے ضعف وعجز کو نہ دیکھے اور غرور سے اکڑے تو یہ اس کی انتہائی بدبختی اور شقاوت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین کو شہادت میں پیش کر کے انسان کے ضعف وعجز اور اس کی مشقت کو یاد دلایا ہے۔ اور پھر اس کی ناشکری پر ملامت کی ہے۔ کہ اس بے بسی کے باوجود اس مور ناتوان کے کبر و غرور کا کیا حال ہے!

یہ قسم کی تاویل ہم نے اس کے خاص مفہوم کے لحاظ سے کی ہے۔ اس سلسلہ میں انسان کا عام ضعف وعجز اور اس کی پر مشقت زندگی بھی قابل غور ہے۔

سورہ روم میں فرمایا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ۔	خدا ہی ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے بنا کھڑا کیا اور پھر کمزوری کے بعد توانائی دی۔ پھر توانائی کے بعد کمزوری اور بڑھاپا طاری کیا، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی جاننے والا اور قدرت والا ہے۔

ایک اور مقام پر یوں ہے۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ	کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا پھر وہ علانیہ

مُّبِیْنٌ ۔ (۷۷، یٰسین) جھگڑالو بن گیا۔

یعنی اس ضعیف اور عاجز مخلوق کا حق تھا کہ وہ خدا کی شکر گذاری کرے اور اپنی بے بسی اور بے حقیقی کو نگاہ میں رکھے۔ مگر اس کے کبر کا یہ حال ہے۔ کہ اس نے خود اپنے پیدا کرنے والے سے لڑائی مول لے لی ہے

ایک اور جگہ یہی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ	بلاشبہ انسان پر ایک ایسا وقت آچکا ہے،
مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا	کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا ہم نے انسان
مَّذْكُوْرًا ۝ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	کو مرکب نطفے سے پیدا کیا۔ اس کو الٹتے پلٹتے
مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ	رہے۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا اور
فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ۔	دیکھنے والا بنایا۔

انسان کی بے بسی و لاچارگی اس وقت اور بے نقاب ہو جاتی ہے جب وہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑتا ہوتا ہے۔ اور اس کے تمام اعزہ و اقارب موجود ہوتے ہیں مگر سب عاجز و درماندہ کسی کی بنائے کچھ نہیں بنتی۔ سورہ واقعہ میں ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝	تو کیا جب جان گلے میں آپہنچے اور تم اس
وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝	وقت دیکھا کرتے ہو۔ اور ہم تم سے زیادہ
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ	قریب ہوتے ہیں اس سے۔ لیکن تم دیکھتے
وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ	نہیں اگر تم خود مختار ہو تو جان کیوں نہیں لوٹا

اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ	بیتے، اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو......
تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	....

ایک دوسری جگہ اسی پہلو سے اس کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے۔

کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ وَقِیْلَ	ہرگز نہیں جب جان ہنسلی تک آپہنچے گی
مَنْ رَاقٍ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝	اور چلا اٹھیں گے کہ کوئی جھاڑنے والا ہے
وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ	اور اس کو یقین ہو جائے کہ یہ مفارقت کا
اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ	وقت ہے اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائیگی
(قیامۃ ۳۴)	اس اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا۔

انسان کی بے بسی و لاچارگی اس پہلو سے بھی ہویدا ہے کہ ذرائع معیشت پر اسے ذرا بھی اختیار حاصل نہیں۔ آسمان اور زمین، سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ سب کے سب انسانوں ہی کے لئے مسخر ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ انسان حسب خواہش زمین سے غلہ حاصل کرے اور نہ یہی ممکن ہے کہ اس کی طلب پر بادل اٹھیں اور پانی برسا دیں۔ بلکہ جملہ موجودات حکم الہٰی کی پابند ہیں۔ اس کے حکم کے بغیر نہ تو آسمان سے پانی کی ایک بوند گر سکتی اور نہ زمین اپنے خزانہ میں سے ایک دانہ اس کو بخش سکتی۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان ان تمام نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود غرور نہ کرے بلکہ اس پروردگار کا شکر گذار رہے جو اس کے لئے اس قدر وسیع دسترخوان بچھا کر بھی جب چاہے اس کو بھوکا ہلاک کر سکتا ہے۔

سورہ نمل میں ہے۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ
بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا
شَجَرَهَا ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ
قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ أَمَّنْ جَعَلَ
الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ
أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا
ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ
لَا يَعْلَمُوْنَ أَمَّنْ يُّجِيْبُ
الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ
السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ
الْأَرْضِ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا
مَّا تَذَكَّرُوْنَ أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ
فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

بھلا آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اور
آسمان سے تم لوگوں کے لئے پانی برسایا
پھر پانی کے ذریعہ سے ہم نے خوشنما باغ اگائے
تمہارے بس کی بات تو تھی نہیں۔ کہ تم ان
کے درختوں کو اگا سکو۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی
معبود ہے بلکہ یہ راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں
بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور
اس کے وسط میں ندی نالے جاری کئے
اور اس کے لئے اٹل پہاڑ قائم کیا اور دو
سمندروں میں پردہ ڈال دیا کیا خدا کے
ساتھ کوئی معبود ہے بلکہ ان میں اکثر لوگ
سمجھتے نہیں، وہ کون ہے کہ جب کوئی مصیبت
زدہ اس سے فریاد کرے۔ وہ اس مصیبت
زدہ کی فریاد سنے اور مصیبت کو ٹال دے
اور زمین میں تمہیں اپنا جانشین بناتا ہے، کیا
خدا کے ساتھ کوئی معبود اور بھی ہے، تم بہت

وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا
بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ
مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ
اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ
ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ
مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

کم تذکر کرتے ہو کون تم کو خشکی اور تری کی تاریکیوں
میں راہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے
ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لئے بھیجتا ہے کیا
خدا کے ساتھ کوئی معبود ہے۔ خدا کی ذات با
برکت شرک سے منزہ ہے۔ کون ہے جو مخلوقات
کو پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور
کون تم لوگوں کو آسمان اور زمین سے روزی
دیتا ہے کیا کوئی خدا کے ساتھ اور بھی معبود
ہے۔ کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو
تو دلیل لاؤ

ایک دوسرے موقع پر ہے۔

(سورہ روم ۴۷)

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ
فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ
فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ
يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ
اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ

خدا ہی وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پس
وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں۔ پھر بادل کو آسمان
میں پھیلاتا اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے
پس تم دیکھتے ہو کہ بادل کے بیچ سے مینہ نکلتا
ہے۔ پھر جب خدا اپنے بندوں میں سے جس
پر چاہتا ہے اس کو برساتا ہے۔ دفعتاً وہ

إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ ۝ فَانْظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ (پ ۲۱ ع ۸) . . . .

مگن ہو جاتے ہیں باوجودیکہ پانی کے برسنے سے پہلے یہ ناامید تھے۔ پس خدا کی رحمت کے مظاہر پر غور کرو خدا مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ بیشک وہ مردوں کا جلانے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اگر ہم ہوا چلا دیں اور یہ کھیتی پیلی دیکھیں تو اس کے بعد ہی یہ ناشکری کریں گے۔ . . . . .

ان آیات پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ تمام اشیاء جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے سب پر خداوند تعالیٰ ہی کا تصرف اور قبضہ ہے اگر آسمان پانی کی دولت روک لے یا زمین اپنے خزانے اگلنا بند کر دے یا ہوائیں چلنا بند ہو جائیں تو پھر کوئی دوسری طاقت ایسی نہیں۔ جو انھیں حرکت میں لا سکے۔ اگر انسان کو ان پر تصرف کی قدرت ہوتی تو پانی کی سخت ضرورت کے وقت وہ امید بھری نظریں آسمان کی طرف نہ اٹھاتا، بلکہ اپنی قدرت کا استعمال کرتا، مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ ایسے اوقات میں وہ خداوند تعالیٰ ہی سے پانی کے لئے دعائیں اور التجائیں کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی انسان کے سامنے اس کے ضعف و عجز کو بالکل بے نقاب کر دیتا ہے تو انسان اپنے کبر و نخوت کو بھول کر صرف خدا ہی کو یاد کرتا ہے۔

سورہ یونس میں ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ
دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ
قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ
مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ
مَّسَّهُ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
(پ۱۱ ع ۷)

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو پڑا یا
بیٹھا یا کھڑا ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اس
کی تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں۔ تو
ایسا چل دیتا ہے کہ گویا اس تکلیف کے لئے
جو اسے پہنچی تھی ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ ایسے
ہی حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے ان
کے اعمال ان کی نظروں میں کھبا دیئے گئے
ہیں۔

ایک دوسری جگہ مشکلات میں اس کی بیچارگی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا
رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ
نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ
يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ
لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِ
قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا
إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ
سورۃ زمر

اور جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ
اپنے پروردگار کی طرف رجوع ہو کر اسی کو
پکارتا ہے۔ پھر جب اسے اپنی نعمت سے
نوازتا ہے تو جس کے لئے پہلے اس نے
پکارا تھا۔ اس کو فراموش کر جاتا ہے اور خدا
کا شریک ٹھہرا لیتا ہے تاکہ اس کی راہ سے
گمراہ کر دے کہدو کہ چند روز لذت دنیا سے

بحالت کفر متمتع ہونے بیشک تو دوزخیوں

میں سے ہے۔

پیش نظر سورہ کی قسموں سے متعلق جو آیات اوپر ہم نے نقل کی ہیں، ان سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہے۔ کہ چونکہ مکہ ایک بہت ہی بے آب و گیاہ خطہ میں واقع تھا اور ذرائع معاش کا وہاں فقدان تھا۔ اس لئے اس سے اہل عرب کے ضعف و بیچارگی پر استدلال ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت تھی اور عام اولاد آدمؑ کے احوال بھی اسیطرح کے ہیں۔ پس انسان کی مشقت اور اس کے ضعف و عجز کو یاد دلا کر اس کو کبر و نخوت سے روکا اور اتفاق و مرحمت کی وصیت فرمائی ہے۔ جو شکر اور عبدیت کے بالکل ابتدائی مظاہر ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

وَالعَادِيَاتِ ضَبْحاً

(قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے دوڑتے ہیں)

سورہ عادیات کی تلاوت کے وقت ہر طالب قرآن کے ذہن میں اس کی قسم کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اسلئے ہم اسی سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس باب میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ والعادیات کا موصوف کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس سوال کا جو جواب ہمارے مفسرین کرام نے دیا ہے، پہلے اسے پیش کر دیا جائے۔

مفسرین اس کے بارے میں دو جواب دیتے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ العادیات خیل "گھوڑوں" کی صفت ہے۔

۲- دوسری جماعت کا یہ خیال ہے۔ کہ العادیات کا موصوف ابل "اونٹنیاں" ہیں۔

ان دونوں قولوں میں پہلا قول اہل علم کے نزدیک زیادہ مشہور و مستند ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کی تائید لغت، کلام عرب، اور سیاق وسباق سے بھی ہوتی ہے، اور دوسرے قول کی تائید کسی نہج سے بھی نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بعض غریب شواہد سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لفظ عدو (تیز دوڑنا) کی نسبت اونٹوں کی جانب بھی ہوتی ہے۔ لیکن لفظ ضبح سے متعلق تو ایک غریب شہادت بھی دیوان عرب میں ایسی نہیں ملتی جس سے اس کے اونٹوں کی جانب انتساب کی تائید ہوتی ہو۔ پس ہمارے نزدیک بھی قابل ترجیح پہلا ہی قول ہے۔ اور اس کی چند موٹی موٹی وجہیں یہ ہیں۔

۱- عدو (تیز دوڑنا) اور ضبح (ہانپنا) کا استعمال خیل ہی کے لئے متداول ہے۔
علامہ ابن جریر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں مذکورہ بالا قولوں کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

واولی القولین فی ذلک عندی	میرے نزدیک ان دونوں قولوں میں مرجح
بالصواب قول من قال عنی	قول انھیں لوگوں کا ہے جو العادیات سے
بالعادیات الخیل وذلک ان الابل	خیل مراد لیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ضبح
لا تضبح وانما تضبح الخیل	گھوڑوں ہی کے لئے مخصوص ہے اونٹوں میں

یہ صفت نہیں پائی جاتی۔

چونکہ یہ بہت مشہور بات تھی۔ اس لئے امام ابن جریرؒ نے اس کی تائید میں کوئی شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مزید اطمینان کے لئے ہم چند شواہد پیش کرتے ہیں۔

امراء القیس اپنے گھوڑے کی تعریف میں بیان کرتا ہے۔

وتعدو کعدو نجاۃ الظباء　　اخطاھا الحاذق المقتدر

اور وہ ان ہرنوں کی سی چھلانگیں مارتا ہے جو نہایت ہی ماہر شکاری کے تیر سے بچ گئے ہوں۔

خنساء کا ایک مشہور شعر ہے۔

یعدو بہ سابح نھد مراکلہ　　اذا اکتسی من سواد اللیل جلبابا

اندھیرا ہی رہتا ہے کہ ایک تیز رفتار اور قوی ہیکل گھوڑا ممدوح کو لیکر دوڑتا ہے۔

ایک حماسی کہتا ہے۔

خیلا کامثال السعالی شزبا　　تعدو ببیض فی الکریھۃ شوس

ایسے چھریرے بدن کے گھوڑے جو تیز رفتاری میں چڑیلوں کے کان کاٹتے ہیں، ایسے شریف بہادروں کو لے کر دوڑتے ہیں جو میدان جنگ میں بالکل بے خوف ہیں۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

ولو ان حیا فائت الموت فاتہ　　اخو الحرب فوق القارح العدوان

اگر کوئی متنفس موت کے چنگل سے بچ سکتا ہے تو ایک جنگجو سوار برق رفتار اور اصیل گھوڑے
کے ذریعہ بدرجہ اولیٰ بچ سکتا ہے۔
عنترہ کا ایک شعر ہے جس میں گھوڑوں کے لئے "ضبح" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شاہد ہیں گھوڑے جبکہ موت کے حوض (سخت جنگ) میں ہانپتے ہوتے ہیں۔
اپنے اس دعوی کی تائید میں کہ لفظ عدو کی نسبت خیل کی طرف مشہور ہے اور ضبح
خیل ہی کے لئے مخصوص ہے۔ کلام عرب سے ہم بیشمار شواہد پیش کر سکتے ہیں مگر چونکہ
یہ امر کچھ زیادہ دلیل طلب نہیں اس لئے مزید طول دینا کچھ موزوں نہ ہوگا۔
۲۔ سیاق وسباق کا بھی اقتضاء ہے۔ کہ العادیات کا موصوف خیل ہی ہو۔
علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب "البیان فی اقسام القرآن" میں فرماتے ہیں۔

قال الجرجانی کلا القولین
قد جاء فی التفسیر الا ان
السیاق یدل علی انها الخیل
وھو قولہ فالموریات قدحًا
والایراء لا یکون الا للحافر
لصلابتہ واما الخف ففیہ
لین واسترخاء۔

جرجانی فرماتے ہیں یہ دونوں قول (خیل، ابل)
تفسیر میں مذکور ہیں لیکن سیاق وسباق کا اقتضا
ہے کہ العادیات سے خیل ہی مراد ہوں خصوصاً
آیت "فالموریات قدحا" تو اس باب میں حجت
قاطعہ ہے اس لئے کہ ایراء (چنگاری نکالنا)
گھوڑوں کی سم کے لئے مخصوص ہے اونٹ کے
پاؤں تو نرم اور ملائم ہوتے ہیں۔

العادیات کا موصوف خیل ہونے کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے مابعد کی صفتوں کا عطف ف کے ساتھ ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ صفات کا عطف ف کے ساتھ ہونے کی صورت میں جملہ صفتیں ایک ہی موصوف سے متعلق ہوں گی، اور ان تمام صفات کو اگر ایک ہی موصوف کے لئے جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو صرف خیل کے ساتھ یہ جمع ہوسکتی ہیں۔ باقی کسی اور موصوف کے ساتھ یہ جمع نہیں ہوتیں۔

یہاں تک ہم نے والعادیات کے موصوف کی تعیین میں لغت، کلام عرب اور سیاق وسباق سے کام لیا ہے لیکن جب تک قسم اور مقسم علیہ میں کوئی واضح مناسبت معلوم نہ ہو جائے، اس وقت تک ہمارا دعویٰ ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اب ہم قسم اور مقسم علیہ کی مناسبت کی توضیح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

پہلے سورہ کے مضمون کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ فرمایا ہے۔

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُورِيَاتِ	گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے دوڑتے ہیں،
قَدْحًا ۙ فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا ۙ فَأَثَرْنَ	پھر ٹھوکروں سے چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر
بِهِ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا ۙ	صبح کو دھاوا کرتے ہیں، پھر غبار اٹھاتے ہیں
إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۚ وَإِنَّهُ	پھر غول میں گھس جاتے ہیں۔ یہ کہ آدمی اپنے
عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ ۚ وَإِنَّهُ لِحُبِّ	خداوند کا بڑا ناشکرا ہے۔ اور وہ اس کو
الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۚ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا	خوب دیکھتا ہے۔ اور یہ کہ مال کی بڑی محبت
بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۙ وَحُصِّلَ مَا فِي	رکھتا ہے۔ تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبریں

الصُّدُوْرِ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ

اگلوائی جائیں گے۔ اور دلوں کی باتیں کھلوائی جائیں گی کہ اس دن ان کا خدا وند ان سے باخبر ہوگا۔

دیکھئے ان آیات میں کتنی وضاحت سے گھوڑوں کی طاعت و فرمانبرداری اور معرکہ جدال و قتال میں ان کی جان بازی، غبار انگیزی، صف شکنی کو گواہی میں پیش کر کے انسان کی ناشکری کا ذکر کیا ہے۔ کہ بدبخت انسان اپنے خالق و پروردگار کا ویسا شکر گذار اور وفادار نہیں ہے جیسے کہ یہ گھوڑے ہیں۔ یہ وفادار اور جان ہار گھوڑے اپنی پیٹھوں پر سوار کر کے آبادیوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ اور جو کچھ مال و دولت ہاتھ لگتا ہے۔ وہ تمام تر اپنے آقاؤں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اسی کو اپنا مقصد زندگی سمجھتے ہیں، لیکن انسان کا یہ حال نہیں ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ہزار طرح کی نعمتیں پاکر ان کی محبت میں مستغرق ہے۔ اگر اس سارے خزانۂ عیش میں سے ایک حبہ بھی اس کو اپنے پروردگار کی راہ میں قربان کرنا پڑے۔ تو وہ بخالت کرتا ہے اگر واجب حقوق کی ادائگی کا بھی اس سے مطالبہ کیا جائے۔ تو وہ بھویں چڑھاتا ہے، اگر ایک شب کا عیش بھی اس کو تلخ کرنا پڑے تو وہ آزردہ ہوتا ہے، وہ اتنا بھی نہیں دیکھتا کہ جس طرح اس کی ران کے نیچے ایک مرکب ہے جس کی زندگی اور موت تمام تر اس کے لئے ہے۔ اور فدویت و جاں نثاری کا وہ مجسمہ ہر مورچہ پر اس کی مرضی کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے سینہ سپر ہے۔ اسی طرح وہ بھی کسی کے زیر فرمان ہے۔ اور اس کا فرض ہے

کہ وہ اس کی مرضیات کی راہ میں ہر صبح و شام سرگرم کار رہے۔ حالانکہ حق تھا کہ ان بے زبان جانوروں سے وہ سبق لیتا اور جس طرح ان کی باگ ان کے آقاؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ان کے اشاروں پر پھرکی کی طرح ناچتے ہیں اسی طرح اس کی باگ بھی اس کے پروردگار کے ہاتھ میں رہے۔ اور کبھی بھی اس کے حکموں سے سرتابی نہ کرے۔ ان وفادار چوپایوں کی وفاشعاری اور جاں بازی کو مثال قرار دے کر جس طرح یہاں انسان سے شکرگذاری کا مطالبہ کیا ہے۔ اور اس کی ناشکری پر ملامت کی ہے اسی طرح سورہ سورہ زخرف میں بھی ان دونوں باتوں کو بیان فرمایا ہے۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا	اور جس نے ہر قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں اور تمہارے
وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ	لئے کشتیاں اور چوپائے بنائے ہیں۔ جن پر تم سوار
مَا تَرْکَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰی	ہوتے ہو کہ تم ان کی پیٹھ پر اچھی طرح اطمینان
ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَةَ	سے بیٹھ جاؤ۔ پھر جب اطمینان سے ان پر بیٹھ
رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ	جاؤ تو اپنے پروردگار کا احسان یاد کرو اور اس
وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا	کا شکریہ ادا کرو کہ پاک ہے وہ ذات جس
هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ	نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے اور
اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ وَجَعَلُوْا لَهٗ	ہم ان کو قابو میں کر لینے والے نہ تھے اور ہم کو
مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ	اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور
لَکَفُوْرٌ مُّبِیْنٌ۔	اس کے لئے اس کے بندوں میں سے ایک حصہ

مخصوص کیا اور انسان بڑا ہی ناشکر گذار ہے
ہر چند کہ اس آیت میں موقع کے اقتضاء سے بعض اور پہلو بھی شکر گذاری کے آگے
ہیں لیکن سورہ عادیات میں جو پہلو پیش کیا گیا ہے۔ وہ بھی اس میں موجود ہے اسی طرح
سورہ نحل میں بھی انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ
فَاِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ وَالْاَنْعَامَ
خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ
وَمِنْهَا تَاْكُلُونَ وَلَكُمْ فِيهَا
جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ
تَسْرَحُونَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى
بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ اِلَّا
بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ
لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ وَالْخَيْلَ
وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا
وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ . . . .
. . . .

اس نے انسان کو صاف شفاف پانی کی بوند
سے پیدا کیا۔ پس وہ کھلم کھلا سرکشی پر آمادہ
ہو گیا۔ اور اسی نے چارپایوں کو پیدا کیا جن میں
تمہارے لئے سامان سرما اور بیشمار فوائد ہیں
اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور جب
شام کے وقت گھر واپس لاتے ہو اور جب
صبح کو چرانے لے جاتے ہو تو ان میں تمہارے
لئے زینت ہے۔ اور جن شہروں تک تم بے مشقت
کے نہیں پہنچ سکتے۔ چارپائے وہاں تک تمہارے
لئے بوجھ لے جاتے ہیں۔ بیشک تمہارا پروردگار
شفقت والا اور مہربان ہے اور اسی نے گھوڑوں
اور خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان
سے سواری کا کام لو اور تاکہ وہ موجب زینت

ہوں اور وہی ان اشیاء کا بھی مالک ہے

(۴-۸ نحل) جنھیں تم نہیں جانتے ۔

ان آیات پہ اگر غور کیجیے تو یہ بھی سورہ عادیات کی آیات سے ایک گہری مناسبت رکھتی ہیں۔ سورہ عادیات میں انسان کی سرکشی اور ناشکری ان الفاظ میں بیان ہوتی ہے

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ" اور یہاں اس کے استکبار و شر انگیزی کا ذکر اس طرح ہوا ہے ۔

"خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ" وہاں گھوڑوں کو مع ان کے مخصوص اوصاف کے باسلوب قسم ان الفاظ میں ذکر کیا "وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا فَالْمُوْرِيَاتِ قَدْحًا فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا" اور یہاں عموم کا پہلو لئے ہوئے گھوڑے اور دیگر حیوانات کی تسخیر و اطاعت ان الفاظ میں بیان فرمائی۔ "وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" پس ان دونوں مقاموں کی آیات میں فرق محض عموم و خصوص کا ہوگا۔ اور موقع و محل کے اقتضاء سے ایسا ہونا ناگزیر تھا ۔

اب اگر ان تمام آیات کی روشنی میں قسم اور مقسم علیہ کی مناسبت پہ غور کیا جائے تو نتیجہ تک پہنچنا کچھ مشکل نہ ہوگا ۔ مگر یہاں معاملہ کے ایک خاص پہلو کو واضح کرنے کے لئے ایک

مختصر تمہید ضروری ہے جو انشاءاللہ اصل بحث کی توضیح میں معین ہوگی۔

اس دنیا میں جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں سب کے ساتھ کچھ فرائض لگا دیئے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں چونکہ ارادہ واختیار سے محروم ہیں۔ اس لئے بغیر کسی انحراف و اعراض کے اپنے اپنے فرائض میں سرگرم ہیں، سورج اپنے مرکز پر گردش کرتا ہے۔ چاند اپنے محور پر چکر کرتا ہے۔ ستارے اپنے وقت پر طلوع ہوتے ہیں۔ موسم اپنے بندھے ٹکے نظام کے مطابق بدلتے ہیں۔ مینہ برستا ہے پھول کھلتے ہیں، فصلیں پکتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایسی باقاعدگی اور درستگی کے ساتھ ہوتا ہے کہ کبھی اس میں فرق نہیں پڑتا۔ ان تمام اشیائے کائنات کا اپنے اپنے فرائض میں منہمک رہنا اور کبھی ان سے غفلت نہ کرنا ان کی عبادت وبندگی اور ان کا تسبیح وسجدہ ہے۔ انگور کی ٹٹی سال میں جب پھل دے کر سبکدوش ہو جاتی ہے۔ تو گویا وہ اپنے خالق کے مقرر کئے ہوئے فریضہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہوگئی ہے۔ اور اپنے رب کے حضور اپنی ثمربار شاخوں کے سجدے پیش کر کے اپنی عبادت سے فارغ ہوگئی پس اس طرح گویا یہ ساری کائنات اپنے طرز عمل سے انسان کو شکر گزاری اور طاعت خالق کا درس دے رہی ہے لیکن انسان چونکہ ارادہ واختیار کی نعمت سے سرفراز ہے۔ اس لئے اکڑتا ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جابجا کائنات کی سرفگندگی اور طاعت کا نمونہ انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ تاکہ وہ اس سے سبق حاصل کرے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ   ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں

الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ
شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ
لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ
كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

سب کے سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور
جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد کے ساتھ اس
کی تسبیح کر رہی ہیں مگر تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے
بیشک وہ بڑا تحمل والا اور بخشنے والا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر یوں ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ
بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ
مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ
الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ
حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ
مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(۱۲-۱۴ النحل)

اور اسی نے رات اور دن اور سورج اور چاند
تمہارے کام میں لگایا ہے۔ اور ستارے بھی
اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔ بیشک ان
چیزوں میں عقل والوں کے لئے شہادتیں ہیں
اور جو چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں ان کے
رنگ مختلف ہیں۔ ان میں ان لوگوں کے لئے
جو تذکرہ کے لئے آمادہ ہیں بڑی دلیل ہے۔
اور اسی نے دریا تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے
تاکہ تم ان سے مچھلیوں کا تازہ گوشت کھاؤ
اور اس سے زیور نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور تم
دیکھتے ہو کہ کشتیاں پانی کو پھاڑتی ہوئی دریا میں
چلتی ہیں اور تاکہ تم لوگ خدا کا فضل تلاش کرو

اور تاکہ خدا کا شکر کرو۔

ایک اور جگہ یوں مذکور ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۱۸-حج)	کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چارپائے خدا کے آگے سرنگوں ہیں اور بہت سے آدمی، اور بہت سے ہیں جن پر عذاب لازم ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کر دے تو پھر اسے عزت دینے والا کوئی بھی نہیں خدا جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔

سورہ نور میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۴۱-نور)	اور تم نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ جتنی مخلوقات آسمان اور زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں اور پرند پر پھیلائے سب کو اپنی نماز اور اپنی تسبیح معلوم ہے اور خداوند تم ان کے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

سورہ رحمٰن میں ہے

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ

سورج اور چاند ایک نظام سے گردش میں ہیں اور ستارے اور درخت خدا کے آگے سجدہ ریز

ان آیات میں آسمان، زمین، سورج، چاند، کواکب، جبال، شجر، دواب اور دیگر موجودات کی طرف تسبیح، حمد، سجود، صلوٰۃ کی نسبت کی ہے! اور پھر انہیں چیزوں کو اس سے زیادہ عمومیت کے ساتھ سورہ نحل میں لفظ تسخیر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات کی مشین کا خدا کی مشیت کے مطابق چلنا یہی اس کی تسبیح، حمد، سجدہ اور نماز ہے۔ بالفاظ دیگر جملہ چیزوں کا اپنے اپنے فرائض میں لگے رہنا ہی ان کی طاعت و عبادت ہے! اور ان سے انحراف ظلم و عدوان ہے

پس ضرور ہے کہ وہ انسان جس کی چاکری کے لئے اتنا عظیم الشان کارخانہ ہمہ آن رواں دواں ہے۔ اس کی زندگی کا بھی کوئی عظیم الشان مقصود ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ خالق کائنات نے اس کو محض اس لئے پیدا کیا ہو کہ وہ مخلوقات کی کمائی سے لطف اندوز ہو اور خود ہر طرح کی ذمہ داری سے سبکدوش اور غیر مسئول ہو۔ ہماری عقل اور فطرت اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی باور نہیں کر سکتی۔ ضرور ہے کہ جس طرح جملہ مخلوقات حسب امر الٰہی انسان کی ضروریات کے لئے وقف ہیں اور وہ انسان پر قربان ہونے ہی میں اپنے مولیٰ کی رضامندی سمجھتی ہیں۔ اسیطرح بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ منعم حقیقی کی راہ میں قربانی دے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو فرض شناسی میں جوہر ادراک کے باوجود وہ جملہ موجودات سے پیچھے ہوگا۔

اس تمہید کو پیش نظر رکھ کر اب قسم اور مقسم علیہ کی مناسبت پر غور کیجئے اس میں تو شک نہیں کہ عرب قوم ایک بہادر قوم تھی۔ اس کے ایک ایک فرد کی زندگی کا بیشتر حصہ میدان جنگ میں بسر ہوتا تھا جنگجوئی ان کے یہاں شرف و عظمت کا معیار تھی بہادر ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر گھوڑے ان کے لئے لازمۂ حیات تھے اور اسی وجہ سے ان کے یہاں گھوڑوں کی محبوبیت کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کے نسب نامے تک محفوظ رکھے جاتے۔ اور گھوڑوں کی مدح و توصیف کا یہ عالم تھا کہ کہنا چاہئے۔ کہ گویا عربی شاعری کا اصلی مضمون یہی تھا جو لوگ عربی شاعری اور عربی مذاق سے واقف ہیں۔ ان کے لئے اس کے ثبوت کی ضرورت نہیں ہم محض بر سبیل ذکر چند شعر پیش کرتے ہیں جو بروقت حافظہ میں محفوظ ہیں۔

امراء القیس اپنے گھوڑے کی محبوبیت بیان کرتا ہے جو یقیناً اس کی وفاشعاری اور خوش سلیقگی اور جانبازی کا نتیجہ ہے۔

حبیب الی الاصحاب غیر ملعن　　　　یفدونہ بالامھات وبالاب

دوستوں کی نظروں میں وہ کھبا ہوا ہے۔ لوگ اس پہ ماں باپ سے فدا ہوتے ہیں۔

ایک حماسی کہتا ہے۔

وذی فرس نہد عتیق جعلتہ　　　　حجابا لبیتی ثم اخدمتہ عبدا

اور ایک ایسے اصیل اور گٹھے ہوئے گھوڑے کی خرید میں قرض کے روپے صرف کرتا ہوں۔ جو میرے زنانہ کا پردہ ہے پھر اس کے لئے ایک خادم بھی رکھا ہے۔

امراء القیس میدان جنگ میں اپنے گھوڑے کی کمال اطاعت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

مکر مفر مقبل مدبر معا کجلمود صخر حطه السیل من عل

بزعم میں بے دھڑک گھس جانے والا اور ساتھ ہی موقع پر آگے بڑھنے والا اور پیچھے پھر جانے والا تیز رفتاری، چھریرے پن اور نشاط میں حلب کھانے والے برق رفتار ہرن کے مانند ہے۔

ایک حماسی کہتا ہے۔

فلقد ارانی للرماح دریئة من عن یمینی مرة وامامی
حتی خضبت بما تحدر من دمی اکناف سرجی او عنان لجامی

پس میں بائیں اور آگے سے نیزوں کا ہدف اپنے کو پاتا ہوں۔ یہاں تک کہ اپنے خون سے اپنے زین کے اطراف وجوانب اور اپنی لگام کی باگ رنگین کر دیتا ہوں۔

ایک دوسرا حماسی کہتا ہے۔

تلاقوا جیاد الاتحید عن الوغی اذا ما غدت فی المازق المتدانی

ایسے اصیل گھوڑوں سے سابقہ پڑے گا۔ جو میدان جنگ سے ہٹنا نہیں جانتے خصوصاً جبکہ وہ گھمسان کے معرکہ میں ہوتے ہیں۔

میدان جنگ میں گھوڑوں کی وفاداری کے متعلق ہر عربوں کی شہادت ہے قرآن نے بھی اس جانی بوجھی اور مسلم چیز کو شہادت میں پیش کیا ہے۔ لیں طریقہ استدلال یوں ہے کہ تیز رفتار چنگاری نکالنے والے، صبح کو غارت گری کرنے والے، گرد و غبار اڑانے والے نرغہ

میں گھس جانے والے گھوڑے شاہد ہیں کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے آقاؤں کی
خدمت میں نہایت چاق چوبند ہیں یعنی کائنات کے خالق نے جس مقصد کے لئے انھیں
پیدا کیا ہے اس کے لئے وہ ہمیشہ رواں دواں رہتے ہیں۔ اور یہاں سے مطلوب ہے
یہ، گویا گھوڑوں کی جدوجہد کو ان کی کمال اطاعت کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ اور انسان کی
اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے جدوجہد نہ کرنے کو خدا کی بغاوت کے مرادف قرار
دیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ کل خدا کی عدالت میں پکڑا جائے۔

انسان کی غفلت و ناشکری کا ذکر قریب قریب اسی اسلوب کے ساتھ سورہ
نحل میں ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ
اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ
وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ
فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا
اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ
بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ
سے نکالا۔ درانحالیکہ تمہیں کچھ بھی علم نہ تھا اور
تم کو کان دیا۔ اور آنکھیں اور دل دیئے۔ تاکہ
تم شکر کرو۔ کیا لوگوں نے پرندوں کے حال پر
غور نہیں کیا۔ جو آسمان کی فضا میں گھرے ہوئے
ہیں۔ ان کو خدا ہی سنبھالتا ہے۔ بیشک اس
میں ایمان والوں کے لئے بڑی شہادتیں ہیں اور
خدا ہی نے تمہارے گھروں کو ٹھکانا بنایا اور چوپایوں
کی کھالوں سے تمہارے لئے گھر بنائے کہ تم اپنے

جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا
يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَ
وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَ
اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى
حِيْنٍ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ
ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ
اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ
تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ
بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝
يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا
وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(۸۰-۸۳ نحل)

کو چلنے کے وقت اور اپنے ٹھہرنے کے وقت ان
کو ہلکا پاتے ہو اور چارپایوں کی اون اور ان
کے روؤں اور ان کے بالوں سے بہت سے
سامان اور بہت سی کام کی چیزیں بنائیں ایک
وقت خاص تک، اور خدا ہی نے اپنی پیدا کی ہوئی
چیزوں کے سائے بنائے اور پہاڑوں میں تمہارے
لئے چھپ بیٹھنے کو جگہ اور تمہارے لئے کرتے
بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے جو تم
کو تمہاری زد سے بچائیں۔ یوں اپنی نعمتیں تم
لوگوں پر پوری کرتا ہے تاکہ اس کے آگے نیاز
مندانہ جھک جاؤ۔ اگر اس پر بھی وہ اعراض
ہی کریں تو تمہارے ذمہ تو کھلے طور پر پہنچانا
ہی ہے۔ خدا کے احسانات سے یہ خوب واقف
ہیں۔ مگر پھر بھی ان کا انکار کرتے ہیں اور ان
میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔

ان آیات پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان خالق کائنات
کی جن نوازشوں کا مورد ہے ان سے کائنات کی جملہ چیزیں محروم ہیں۔ مثلاً انسانوں کو

خداوند تعالیٰ نے سمع و بصر اور دل بخشا ہے اور دوسری طرف ان کے لئے ایسے وسائل و اسباب مہیا کر دیئے ہیں جن سے انسان اپنی مادی زندگی کا انتظام بآسانی کر سکتا ہے، رزاق عالم کی یہ روحانی و مادی نوازشیں مقتضی ہیں کہ انسان ہر طرف سے کٹ کر اسی کے آستانہ پر جبہ سائی کرے۔ سب سے کنارہ کش ہو کر اسی سے رشتہ جوڑے، جو انسان اس فرض سے غافل ہے حقیقت میں اس کا باطن تاریک ہے اور اس کی آنکھیں بھی بند ہیں، اگر اس کی آنکھیں بند نہ ہوتیں تو فضا کی چڑیوں سے وہ سبق حاصل کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ فضا کی چڑیاں حسب ارشاد الٰہی أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ حمد الٰہی میں زمزمہ سنج ہیں اور غافل و سرمست انسانوں کو دعوت دے رہی ہیں کہ وہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی کبریائی و قدوسیت کی تسبیح پڑھے کہ یہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ الغرض جسطرح سورہ عادیات میں خطرات کے وقت گھوڑوں کی وفاداری اور اطاعت شعاری کو پیش کر کے غافل انسانوں کو شکر گذاری کی دعوت دی ہے بعینہ یہاں بھی تسخیر کے ذکر سے ان کے اسی فطری جذبہ شکر کو بیدار کیا ہے۔

شیرازہ: یہ کتاب بھی احسان دانش کی خصوصیات کی شاہد ہے مگر اس دور جیتے ہوئے دن" "بنارس" اور "شام اودھ" جیسی اور بھی کئی نظمیں ایسی ہیں جو تاریخ ادب میں اب تک اپنا جواب نہیں رکھتیں نظموں کے علاوہ تقریباً نوّے صفحات میں صرف غزلیات ہیں جو اس بات کی شاہد ہیں کہ احسان جہاں نظم لکھتے ہیں شاہکار لکھتے ہیں۔ وہاں غزل میں بھی اس کا ایک مقام ہے

قیمت۔ دو روپے "عہ"

مقامات: اس مجموعے میں شاعر تفصیلی خود گیری سے ہٹ کر سیاسی اسرار و رموز کی طرف مائل ہے اس کتاب میں ان کی ہر نظم تفصیل سے بے نیاز اپنی جامعیت مقصد اور مقام کے ساتھ شاعر کی دلی تڑپ کی آئینہ دار ہے۔ جسے احسان اپنی بے جھجکے کی شاعری بتاتا ہے۔

قیمت۔ اڑھائی روپے "عہ"

گورستان: یہ احسان دانش کی ایک طویل نظم ہے جو انہوں نے اپنی والدہ کی وفات سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ اب ناظرین اندازہ لگائیں کہ اس غم نگار شاعر نے اس میں کیا کہا ہو گا۔ طرّہ یہ ہے کہ آپ اس نظم میں ادب کا ہر پہلو پائیں گے۔

اس پر ڈاکٹر محی الدین زور پی۔ ایچ ڈی، شاہ معین الدین ندوی مدیر معارف، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علامہ نیاز فتح پوری اور حضرت اثر احسنی نے جو مقدمات لکھے ہیں۔ ان میں ہر مقدمہ اپنی جگہ ایک مستقل مضمون ہے موت پر۔

قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ "عہ"

نفیر فطرت: یہ مصنف کا وہ کلام ہے جو ان کی پہلی دو کتابوں "حدیث ادب" اور "درد زندگی" کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اب اس میں جدید کلام کا اضافہ کر کے نفیر فطرت کے نام سے شائع کیا ہے۔

قیمت ساڑھائی روپے "عہ"

تاریخ انقلاباتِ عالم

از سید ابو سعید بزمی ایم اے۔

دو جلدوں میں ابتدائے آفرینش سے موجودہ دور تک کے انقلابات کی مکمل و مفصل تاریخ

قیمت: جلد اول دس روپے، جلد دوم دس روپے

زندگی کے جائزے

از سید ابو سعید بزمی ایم اے

افسانوی رنگ میں وہ سماجی واقعات و مشاہدات جن کو فاضل مصنف نے بے اختیار کاغذ پر لانے کے لئے مجبور ہو گیا اور ایک جزو ضروری ہیں ہندوستانی سیاسی کشمکش کا جس کو فلسفہ تاریخ سیاست اور مذہب کی دس اہم اور پیچیدہ کتابیں پڑھنے کی فرصت نہ ہو اس کے لئے "زندگی کے جائزے" کافی ہے۔

قیمت اڑھائی روپے

خونیں داستانیں

قاضی اطہر مبارک پوری

اس کتاب کو تاریخ مظالم کہا جائے تو درست ہوگا۔ کیونکہ پہلی صدی ہجری سے اب تک آئمہ، صحابہ، اور علماء کو حق و صداقت پر جو لرزہ خیز سزائیں دی گئی ہیں اس میں وہ تمام خونیں مناظر اور جگر پاش واقعات پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت پانچ روپے

اسلامی روایات کا تحفظ

سید جمیل واسطی ایم اے (کینٹب)

اس کتاب میں مسلمانوں کے موجودہ دور کی تمدنی تشریح ملے جس سے قوم کے امکانی عروج و زوال کا جائزہ ہیں اس کتاب کا مطالعہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے خدوخال کو ابھارے گا۔

فاضل مصنف نے اپنی تحقیق و تجسس سے سلامی معاشرت تہذیب اور سیاست کے ان پہلوؤں پر بحث کی ہے جو یا تو تاریک اور مسخ ہو چکے ہیں یا تباہی اور تخریب کی زد پر ہیں۔

یقین کامل ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری اور علمی ادارے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

قیمت سوا دو روپے ۴/۲